جلد اوّل

اِصلاحی مجالِس

بسلسلہ تہذیبِ اخلاق و تربیتِ باطن

- تصوف کی حقیقت
- مجاہدہ و ریاضت
- بدنظری اور اس کا علاج
- غیبت اور اس کا علاج
- بدگمانی اور اس کا علاج
- تجسس اور اس کا علاج
- تکبّر اور اس کا علاج

حضرت مولانا مُفتی مُحمّد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

عرضِ مرتّب

استاذ مکرم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اللہ جل شانہ نے علم ظاہری و باطنی دونوں سے نوازا ہے۔ ایک طرف آپ شیخ الحدیث ہیں، تو دوسری طرف آپ پیر طریقت بھی ہیں۔ جس طرح طبیب جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں، اس طرح آپ روحانی بیماریوں کا علاج فرماتے ہیں، اور اس وقت سینکڑوں روحانی مریض آپ کے زیرِ علاج ہیں۔

"رمضان المبارک" کو اصلاحِ باطن کے لئے خاص مناسبت حاصل ہے، اس لئے حضرت والا مدظلہم نے اصلاحِ باطن کی مجالس کے لئے اس مہینے کو منتخب فرمایا چنانچہ کئی سالوں سے رمضان المبارک میں بعد نمازِ ظہر اصلاحی مجالس کا سلسلہ جاری ہے۔ اور سینکڑوں طالبین اصلاح اس مجلس سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

احقر کو اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کی صحبت اور آپ کے قرب کی عظیم نعمت سے محض اپنے فضل و کرم سے نوازا ہوا ہے، چنانچہ اس قرب سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے احقر نے وہ مجالس ریکارڈ کرلیں، اور اب ان حضرات تک ان مجالس کو پہنچانے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جو دُور ہونے کی وجہ سے براہِ راست ان مجالس سے فیضیاب نہیں ہوئے، اب ان مجالس سے فائدہ اُٹھانا، اور ان پر عمل کرکے اپنی زندگیوں میں تبدیلی لانا آپ کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کے درجات بلند فرمائے۔ عمر میں برکت عطا فرمائے۔ اور مجھے اور آپ سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

عبداللہ میمن

دارالعلوم کراچی ۱۴-۹؍ شعبان ۱۴۲۱ھ

اجمالی فہرست "اصلاحی مجالس"

☆☆☆

پہلی مجلس

تصوف کی حقیقت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

پہلی مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العٰلمين، والعاقبة للمتقين، والصلوٰة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله وأصحابه اجمعين أما بعد:

کئی سال سے رمضان المبارک میں حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سنانے کا معمول ہے۔ سنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے اندر اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہو، رمضان المبارک کا مہینہ خصوصی طور پر اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے۔ اگر انسان اس ماہ کی قدر کرے اور اس ماہ میں اپنی اصلاح کی فکر اور اس کا اہتمام کرے تو وہ جلد منزل کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے کئی سالوں سے رمضان المبارک میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے (تہذیب اخلاق سے متعلق) ارشادات سنانے کا یہ سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جو کتاب اس وقت میرے سامنے ہے، اس کا نام "انفاس عیسیٰ" ہے، یہ کتاب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحی ملفوظات، آپ کی تربیتی ہدایات اور نفسانی امراض کے علاج کے لئے سفید اور مجرب نسخوں کا خلاصہ ہے جس کو حضرت والا کے خاص خلیفہ مجاز حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کیا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء کی بڑی تعداد ہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنی بساط اور صلاحیت کے مطابق حضرت والا سے کسب فیض کیا، اور ان میں سے ہر ایک ہمارے لئے آفتاب اور مہتاب کا درجہ رکھتا ہے، لیکن ہر خلیفہ میں کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو اس کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت والا کے ابتدائی دور کے خلفاء میں سے ہیں، ان کے بارے میں یہ بات معروف اور مشہور ہے کہ حضرت والا کے ساتھ مشابہت میں ان کی کوئی نظیر نہیں تھی، ظاہری شکل وصورت، لباس و پوشاک، چال ڈھال، رفتار و گفتار، ہر چیز میں حضرت والا کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت تھی، یہاں تک کہ آواز میں بھی مشابہت تھی۔ چنانچہ جب آپ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تو باہر سے سننے والے کو دھوکہ ہو جاتا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تلاوت کر رہے ہیں یا حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب تلاوت کر رہے ہیں، اتنی زیادہ مشابہت تھی۔ اور جب ظاہری مشابہت اتنی زیادہ تھی تو اندر اور باطن میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کیا کیا کسب فیض کیا ہوگا، اس کا اندازہ ہم اور آپ کر ہی نہیں سکتے۔

جب کسی کو اپنے شیخ کے ساتھ شدید محبت ہو، مناسبت کامل ہو اور پھر

طویل صحبت اور رفاقت رہی ہو اور اکتساب فیض رسوخ کے ساتھ کیا ہو تو بسا اوقات ظاہری انداز و عادات میں بھی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ میں بھی اس کی مثال ملتی ہے، چنانچہ روایات میں آتا ہے (کان اشبه الناس برسول الله صلی اللہ علیہ وسلم دلاً وسمتا وهديا) کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اپنے انداز و ادا میں، اٹھنے بیٹھنے میں، چال ڈھال میں، لباس پوشاک میں جتنی مشابہت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی، اتنی مشابہت کسی اور کو حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ لوگ ان کو دیکھ کر اپنی آنکھیں اس طرح ٹھنڈی کیا کرتے تھے جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے ٹھنڈی کیا کرتے تھے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو بہر حال ایک الگ حیثیت رکھتا ہے، تاہم اس سے ملتی جلتی کیفیت کے نمونے امت میں پائے گئے ہیں، اسی طرح کا ایک نمونہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب اور ان کے شیخ علیہ الرحمۃ کا بھی ہے۔ جس شخص میں ظاہری طور پر بھی ایسی مشابہت ہو جائے اس کے بارے میں یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ اپنے شیخ کے مزاج و مذاق اور ان کے علوم و فیوض کو جذب کئے ہوئے اور پوری طرح ہضم کئے ہوئے ہے۔

انفاس عیسیٰ

بہر حال، حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اور خدمت میں رہنے کے دوران حضرت والا سے جو باتیں سنیں اور جو تعلیمات حاصل کیں، ان کا خلاصہ ہمارے لئے اس کتاب ”انفاس

عیسیٰ" میں جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب حضرتؒ کے دیگر عام ملفوظات کے مجموعوں کی طرح ملفوظات کی کتاب نہیں ہے، چنانچہ عام ملفوظات اور مجالس کی کتابوں میں یہ نظر آئے گا کہ حضرت والا نے کسی موضوع سے متعلق ایک بات ارشاد فرمائی، پھر تھوڑی دیر کے بعد دوسرے کسی اور موضوع سے متعلق دوسری بات ارشاد فرمائی۔ اور پھر تیسری بات تیسرے موضوع سے متعلق ارشاد فرمائی، اور ان باتوں کو لوگوں نے جمع کرنا شروع کر دیا۔

لیکن اس کتاب میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہنے کے دوران تصوف اور طریقت سے متعلق جو کچھ سنا اور جو تعلیم حاصل کی، پہلے اس کو ہضم کیا، پھر اس کی تلخیص اس طرح لکھی کہ اس میں اکثر الفاظ بھی حضرت والا ہی کے ہیں۔

اس طرح ان تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہمارے لئے اس کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے، لہٰذا یہ کتاب "انفاس عیسیٰ" ہمارے لئے بڑی عجیب و غریب نعمت ہے۔

تصوف اور سلوک کا مقصود اصلی

تصوف، طریقت، سلوک، احسان، ایک ہی مفہوم کے مختلف عنوانات ہیں، اس تصوف کا اصل مقصود نہ تو محض ذکر ہے، چنانچہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصود "ذکر" ہی ہے، جب ہم کسی شیخ سے بیعت ہو جائیں گے تو وہ ہمیں وظائف بتادے گا۔ اور بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصد عملیات اور روحانی علاج ہے کہ شیخ ہمیں کچھ عملیات اور تعویذ گنڈے اور روحانی علاج کا طریقہ بتائے گا۔ خوب سمجھ لیں کہ "تصوف" کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں،

حتیٰ کہ "ذکر" بھی تصوف کا مقصود اصلی نہیں، بلکہ مقصود اصلی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کہیں تنہائی میں بیٹھ کر مراقبہ کرے، اور چلہ کاٹے، مجاہدے کرے۔ حالانکہ یہ سب چیزیں بھی "تصوف کا مقصود اصلی نہیں ہیں بلکہ مقصود اصلی کو حاصل کرنے کے مختلف طریقے اور راستے ہیں۔

پھر "تصوف" کا مقصود اصلی کیا ہے؟ تصوف کا مقصود اصلی وہ ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں ارشاد فرمایا: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ (سورہ الشمس) یعنی تزکیہ نفس۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے بیان کرتے ہوئے فرمایا "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ" (سورہ بقرہ) اس آیت میں تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کو مقاصد بعثت میں سے بیان فرمایا، پھر "تزکیہ" کو علیحدہ کر کے بیان فرمایا۔ "تزکیہ" کے لفظی معنی ہیں، پاک صاف کرنا۔ شریعت کی اصطلاح میں تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح انسان کے ظاہری اعمال وافعال ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے میں نواہی ہیں مثلاً یہ کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ دو، حج کرو وغیرہ، یہ اوامر ہیں، اور جھوٹ نہ بولو، غیبت نہ کرو۔ شراب نہ پیو، چوری نہ کرو، ڈاکہ نہ ڈالو وغیرہ، یہ نواہی اور گناہ ہیں، ان سے بچنے کا شریعت نے حکم دیا ہے۔

اسی طرح انسان کے باطن یعنی قلب میں بعض صفتیں مطلوب ہیں، وہ اوامر میں داخل ہیں، ان کو حاصل کرنا واجب ہے اور ان کو حاصل کئے بغیر فریضہ ادا نہیں ہوتا، اور بعض صفات ایسی ہیں جن کو چھوڑنا واجب ہے، وہ نواہی میں داخل ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی نعمت پر "شکر کرنا" واجب ہے، اگر کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو اس پر صبر کرنا واجب ہے، اللہ تعالیٰ پر "توکل اور بھروسہ" رکھنا واجب

ہے، "تواضع" اختیار کرنا یعنی اپنے آپ کو کمتر سمجھنا واجب ہے، "اخلاص" حاصل کرنا، یعنی جو کام بھی آدمی کرے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرے، اس اخلاص کی تحصیل واجب ہے، اخلاص کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔ لہٰذا یہ صفات "شکر، صبر، توکل، تواضع، اخلاص، وغیرہ، یہ سب صفات "فضائل" اور "اخلاقِ فاضلہ" کہلاتی ہیں، ان کی تحصیل واجب ہے۔

اسی طرح باطن کے اندر بعض بُری صفات ہیں جو حرام اور ناجائز ہیں جن سے بچنا ضروری ہے، وہ "رذائل" اور "اخلاق رذیلہ" کہلاتی ہیں، یعنی یہ صفات کمینی اور گھٹیا صفات ہیں، اگر یہ صفات باطن کے اندر موجود ہوں تو ان کو کچلا اور مٹایا جاتا ہے، تاکہ یہ صفات انسان کو گناہ پر آمادہ نہ کریں، مثلاً "تکبر" کرنا یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، "حسد" کرنا، "ریاکاری" اور دکھاوا، یعنی انسان اللہ کو راضی کرنے کے بجائے مخلوق کو راضی کرنے کے لئے اور ان کو دکھانے کے لئے کوئی دینی کام کرے، یہ ریا ہے، لہٰذا تکبر حرام، حسد حرام، بغض حرام، ریاکاری حرام، اور بے صبری یعنی اللہ تعالیٰ کی قضا پر راضی نہ ہونا بلکہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرنا، یہ حرام ہے، یہ سب رذائل ہیں جو انسان کے باطن میں موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح غصہ کو اگر انسان بے محل استعمال کرے تو یہ بھی رذائل میں داخل ہے۔

خلاصہ یہ کہ باطن میں بہت سے "فضائل" ہیں، جن کو حاصل کرنا ضروری ہے، اور بہت سے "رذائل" ہیں جن سے اجتناب ضروری ہے۔ اور حضرات صوفیاء اور مشائخ یہ کام کرتے ہیں کہ اپنے مریدین اور شاگردوں کے دلوں میں اخلاق فاضلہ کی آبیاری کرتے ہیں اور اخلاق رذیلہ کو کچلتے ہیں تاکہ یہ اخلاق رذیلہ کچلتے کچلتے نہ ہونے کے حکم میں ہو جائیں۔ جس کے لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ

علیہ نے یہ اصطلاح بیان فرمائی کہ "امالہ بدرجہ ازالہ" یعنی باطن کے اندر جو رذیلہ ہے، اس کو اتنا کچلو اور اس کو اتنا پیٹو کہ اس کے بعد وہ رذیلہ باقی تو رہے گا، ختم تو نہیں ہوگا، لیکن نہ ہونے کے حکم میں ہو جائے گا۔ بہر حال، تصوف میں رذائل کو کچلنا ہوتا ہے اور فضائل کو حاصل کرنا ہوتا ہے، اسی کا نام تزکیہ ہے اور بس یہی تصوف کا مقصود اصلی ہے۔

شیخ کی ضرورت

لیکن عام طور پر یہ چیز کسی شیخ کی صحبت حاصل کئے بغیر اور شیخ کے سامنے اپنے آپ کو فنا کئے بغیر حاصل نہیں ہوتی، کیوں؟ اسلئے کہ "لکل فَنٍّ رِجَالٌ" یعنی ہر فن کو حاصل کرنے کے لئے اسکے ماہر کے پاس جانا ضروری ہے، اگر فقہ کا مسئلہ معلوم کرنا ہو تو کسی مفتی کے پاس چلے جاؤ، کیونکہ اس کو یہ فن آتا ہے، وہ جانتا ہے کہ کس سوال کا کیا جواب دینا چاہئے۔ لیکن اعمال باطنہ کے بارے میں مہارت حاصل کرنا اور یہ پہچاننا کہ آیا اس شخص کے اندر یہ بیماری پیدا ہو رہی ہے یا نہیں؟ کیونکہ باطن کی بیماریاں بھی مخفی اور باریک قسم کی ہوتی ہیں، ایک چیز بڑی اچھی ہے اور دوسری چیز بڑی خراب ہے، لیکن دونوں کے درمیان فرق کرنا بڑا مشکل ہے۔ مثلاً تکبر کرنا حرام ہے اور اس سے بچنا واجب ہے، اس لئے کہ یہ تکبر اُمّ الامراض ہے۔ لیکن دوسری صفت "عزت نفس" ہے، اس کو حاصل کرنا واجب ہے، کیونکہ اپنے نفس کو ذلیل کرنا جائز نہیں۔ لیکن یہ دیکھنا کہ کہاں "تکبر" ہے اور کہاں "عزت نفس" ہے، جو کام میں کر رہا ہوں یہ "تکبر" کی وجہ سے کر رہا ہوں یا یہ "عزت نفس" کی وجہ سے کر رہا ہوں، دونوں کے درمیان کون خط امتیاز کھینچے اور دونوں کو کون پہچانے کہ یہ تکبر ہے اور یہ "عزت نفس"

ہے، یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ خاص طور پر انسان کا خود اپنے اندر ان بیماریوں کا پہچاننا بڑا مشکل ہے۔

مثلاً ایک بیماری ہے "اپنی بڑائی بیان کرنا" کہ میں ایسا اور ویسا ہوں، میرے اندر یہ اچھائی ہے، میرے اندر یہ خوبی ہے، یہ حرام ہے، اسی کو "تعلّی" کہا جاتا ہے۔ دوسری چیز ہے "تحدیث نعمت" جس کا قرآن کریم کے اندر ذکر ہے: ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (سورۃ الضحیٰ) اب کون اس کے درمیان فرق کرے کہ میں جو اپنی اچھائی بیان کر رہا ہوں، یہ "تعلّی" ہے یا "تحدیث نعمت" ہے؟

حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ

اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہوئی ایک بات یاد آگئی، فرمایا کہ ایک مرتبہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ دھلی میں مسجد کے منبر پر بیٹھ کر وعظ فرمارہے تھے، بہت بڑا مجمع سامنے بیٹھا ہوا تھا، وعظ فرماتے فرماتے کہنے لگے کہ آج میں ایک بات آپ لوگوں سے بیان کرتا ہوں، یہ بات مجھ ہی سے سنیں گے اور کسی سے سننے میں نہیں آئیگی، اور میں یہ بات "تحدیثِ نعمت" کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ یہ علم اللہ تعالیٰ نے مجھے ہی القاء فرمایا ہے۔ یہ بات کہنے کے بعد ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئے۔ پھر فرمایا کہ "استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ" میں نے یہ کیا جملہ کہہ دیا کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سن سکیں گے اور کہیں سننے میں نہیں آئے گی، یہ تو دعویٰ اور "تعلّی" ہے اور میں نے اپنی بڑائی بیان کی ہے، اور اس کو میں نے "تحدیثِ نعمت" کا نام دیدیا، لہٰذا میں اس پر استغفار کرتا ہوں "استغفر اللہ،

استغفر اللہ" اول تو میں نے اپنی بڑائی بیان کی، اور پھر اس بڑائی کو "تحدیثِ نعمت" کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی، اور قاعدہ ہے کہ "توبة السرّ بالسّر والعلانية بالعلانية" کیونکہ یہ گناہ میں نے اعلانیہ کیا تھا، اس لئے توبہ بھی اعلانیہ کرتا ہوں کہ یہ مجھ سے غلطی ہوئی، اس غلطی پر استغفار کرتا ہوں، استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ عین وعظ کے دوران یہ کام کیا، اس طرح کوئی دوسرا کر کے دکھائے، یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو مٹا چکا ہو، اپنے کو فنا کر چکا ہو، اور پھر نفس کی باریک چالوں سے باخبر ہو اور اپنے نفس کا نگراں رہتا ہو، اس کا احتساب ہمہ وقت کرتا رہتا ہو۔ اب آپ دیکھیں کہ جو بات میں بیان کر رہا ہوں، یہ "تعلّی" کے طور پر بیان کر رہا ہوں یا "تحدیث نعمت" کے طور پر بیان کر رہا ہوں، ان کے درمیان فرق کرنا بڑا مشکل ہے اور اس کو پہچاننا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

تواضع اور ذلت نفس میں فرق

اسی طرح 'تواضع'' بڑی عمدہ چیز ہے، اعلیٰ درجے کی صفت ہے اور مطلوب ہے، ایک دوسری صفت ہوتی ہے "ذلتِ نفس" یعنی دوسرے کے سامنے نفس کو ذلیل کرنا، یہ حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے نفس کی عزت واجب کی ہے، اس کو ذلیل نہیں کرنا چاہئے، لیکن ان دونوں کے درمیان فرق کرنا کہ کونسا عمل "تواضع" کی وجہ سے کیا جارہا ہے اور کونسے فعل میں "ذلت نفس" ہے، ان کے درمیان فرق کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

ایک واقعہ

اسی فرق کے سلسلے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپناواقعہ بیان فرمایا کہ میں ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہا تھا، ریل میں میرے پاس کچھ دیہاتی بھی بیٹھے ہوئے تھے، سفر کے دوران جب کھانے کا وقت آیا تو ان دیہاتیوں نے اپنے ساتھ جو سالن روٹی لائے تھے، وہ نکال کر سامنے رکھا، اور مجھے بھی کھانے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ حضرت جی! کچھ گوہ موت ہمارے ساتھ بھی کھالو، اس کھانے کو تواضعاً "گوہ موت" کا نام دیدیا، اب بظاہر تو یہ تواضع کی بات تھی، لیکن حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی ناقدری تھی کہ اللہ تعالیٰ کے رزق کو "گوہ موت" قرار دے کر اس کی دوسرے کو دعوت دیا اور بلائے، یہ "تواضع" نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری اور بے توقیری ہے۔

بہر حال، کبھی تواضع کی سرحد ذلت نفس کے ساتھ مل جاتی ہے، اور کبھی اس کی سرحد ناشکری کے ساتھ مل جاتی ہے، اب کس حد تک تواضع کرے اور کس حد پر تواضع نہ کرے، کہاں تواضع ہے کہاں اور ناشکری ہے۔ کہاں تواضع ہے اور کہاں ذلت نفس ہے، ان کے درمیان فرق کو پہچاننا ہر ایک کا کام نہیں جب تک کسی شیخ سے تربیت حاصل نہ کرلے۔

یہ چیز محض پڑھا دینے سے حاصل نہیں ہوتی کہ کتاب میں پڑھ کر کسی چیز کی حد تام معلوم کرلی اور پھر خود ہی اس کے فوائد اور قیود نکالنے شروع کر دیے۔ یاد رکھئے! یہ اس قسم کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ کام عملی تربیت سے آتا ہے، جب کسی شیخ کو مسلسل آدمی دیکھتا رہے اور اس کے طرز عمل کا مشاہدہ کرتا رہے اور اس کو اپنے حالات بتا کر اس سے ہدایات لیتا رہے، اس کے نتیجے میں پھر انسان کو یہ ادراک حاصل ہوتا ہے کہ عمل واخلاق کا یہ درجہ قابل حصول صفت ہے اور یہ کیفیت یا درجہ قابل ترک رذیلہ ہے۔

ایک مثال

میں اس کی یہ مثال دیا کرتا ہوں جیسے ایک گلاب کا پھول ہے۔ کسی بڑے سے بڑے فلسفی اور منطقی سے کہا جائے کہ تم اس گلاب کے پھول کی خوشبو کی ایسی جامع مانع تعریف کرو جو اس کو چنبیلی کی خوشبو سے ممتاز کردے۔ گلاب کے پھول سے بھی خوشبو آرہی ہے اور چنبیلی کے پھول سے بھی خوشبو آرہی ہے، اس کام کے لئے کسی بڑے سے بڑے فصیح اور بلیغ کو بلالو، کسی ادیب اور شاعر کو بلالو اور اس سے کہو کہ گلاب اور چنبیلی کی خوشبو میں فرق بیان کرو، بتایئے! کوئی فرق بیان کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بس اس کے فرق کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ پوچھنے والے سے کہا جائے کہ اس گلاب کے پھول کو سونگھ لو اور اس چنبیلی کے پھول کو سونگھ لو۔ سونگھنے کے بعد پتہ چل جائے گا کہ گلاب کی خوشبو کیسی ہوتی ہے اور چنبیلی کی خوشبو کیسی ہوتی ہے، اس کے علاوہ دونوں کے درمیان فرق معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔

دوسری مثال

ایک مثال اور سنئے! دیکھیں، آم بھی میٹھا ہوتا ہے، اور گڑ بھی میٹھا ہوتا ہے گڑ کی مٹھاس کیسی ہے؟ اور آم کی مٹھاس کیسی ہے؟ دونوں کی مٹھاس میں جو فرق ہے، وہ کسی بڑے سے بڑے فلسفی اور منطقی سے بیان کراؤ، ہرگز بیان نہیں کرسکتا، کیونکہ دونوں کی مٹھاس کا جو فرق ہے وہ زبان سے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا، اس فرق کو جاننے کا یہ طریقہ ہے کہ اس پوچھنے والے کہا جائے کہ تو گڑ بھی کھا اور آم بھی کھا، پھر پتہ چل جائے گا کہ آم کی مٹھاس کیسی ہوتی ہے اور گڑ

کی مٹھاس کیسی ہوتی ہے۔

بالکل اسی طرح انسان کے باطن کے جو فضائل ہیں۔ مثلاً "تواضع" ہے، اگر اس کی لفظوں میں کوئی مکمل تعریف بیان کرنا چاہے تو بہت مشکل ہے، لیکن جب کسی متواضع آدمی کو دیکھو گے اور اس کے طرز عمل کا مشاہدہ کرو گے اور اس کی صحبت میں رہو گے تو اس کے نتیجے میں وہ اوصاف تمہارے اندر بھی منتقل ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اس لئے تصوف اور سلوک میں شیخ کی صحبت اور اس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف باتیں کر لینے سے یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، بلکہ کسی کے سامنے رگڑے کھانے سے اللہ تعالیٰ فضل فرما دیتے ہیں اور یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔

اپنی اصلاح کرانا ضروری ہے

بہر حال، پیر اور شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہونا کوئی فرض نہیں کہ آدمی کسی شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ضرور بیعت ہو جائے، لیکن اپنی اصلاح کرانا ضروری ہے، اور جب اپنی اصلاح کے لئے کوئی شخص اپنے شیخ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس رجوع کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ آدمی کو فضائل حاصل ہوں اور رذائل سے آدمی بچ جائے، ان رذائل کا امالہ ہو اور وہ انسان کے قابو میں آجائیں سلوک و تصوف کا یہ اصل مقصد ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں اذکار اور اوراد یا مختلف وظائف سالک کے لئے معین اور مددگار ہو جاتے ہیں، مگر ہر شخص کے لئے ان اذکار اور اوراد کی مقدار، اس کا موقع اور وقت، یہ شیخ کی رہنمائی اور مشورے سے ہی مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی سے اصلاح حال کا فائدہ ہوتا ہے، ورنہ عام حالات میں یہ اذکار اور اوراد اس درجہ میں خود مقصود

نہیں، بلکہ اصل کام اپنے اخلاق کی اصلاح ہے اور اس کا تزکیہ ہے، جس کے لئے ضروری ہے کہ شیخ کو اپنے حالات کی اطلاع دیتا رہے اور اس سے ہدایات لیتا رہے اور پھر ان ہدایات پر عمل کرتا رہے، بس ساری زندگی یہی کام کرتا رہے۔ شیخ کی طرف رجوع کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے۔

اس کتاب "انفاس عیسیٰ" میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "رذائل" اور "فضائل" سے متعلق جو ملفوظات جمع فرمائے ہیں، ان کو پڑھ لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان کی تھوڑی سی تشریح کر دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو سمجھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور ان کے ذریعہ اپنی اصلاح کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

دوسری مجلس
رذائل کی اصلاح

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

دوسری مجلس

رذائل کی اصلاح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والعاقبة للمتقین، والصلوٰة والسلام علی رسوله الکریم وعلی آله واصحابه اجمعین اما بعد:

رذائل کے اصلاح کی حد

انسان کے باطن میں جو خراب اور فاسد قسم کی صفتیں ہوتی ہیں، ان کو "رذائل" کہا جاتا ہے۔ اس عنوان کے تحت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"سالک کو چاہئے کہ رذائل کی اصلاح شیخ سے ایک ایک کی کرائے، جب ایک رذیلے کی مقاومت پر پوری قدرت ہو جائے اور مادّے کا اضمحلال ہو جائے تو دوسرے رذیلے کا علاج شروع کرے، اور اس رذیلے کے ازالۂ کلی کا کبھی انتظار نہ کرے، کیونکہ یہ ناممکن ہے، بلکہ اس مادّے کے وجود میں ہزارہا حکمتیں ہیں"۔

(انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۳۷)

"سالک" کے معنی ہوتے ہیں "چلنے والا" تصوف کی اصطلاح میں "سالک" اس کو کہتے ہیں جو کسی شیخ کے پاس اپنی اصلاح کرانے کے لئے جاتا ہے، گویا کہ وہ راستے پر چل رہا ہے۔ "تصوف" کو کہتے ہیں "طریق" اور "سالک" اس طریق پر چلنے والا، اور "شیخ" کی مثال رہنما کی ہے جو اس کو راستہ بتاتا ہے کہ اس طرح چلو اور اس طرح کام کرو۔ حضرت نے فرمایا کہ "سالک" کو چاہئے کہ "رذائل" کی اصلاح شیخ سے ایک ایک کی کرائے۔ مثلاً اس کے اندر غصہ ہے، اور "غصہ" ایک رذیلہ ہے، اس کی اصلاح کرانی ہے، غصے کے نتیجے میں مارتا پیٹتا ہے یا ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا ہے، اور غصہ کے اندر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ تو اس شیخ کو بتائے کہ میرے اندر غصہ بہت ہے، اور اس غصے کے نتیجے میں بہت سی غلط باتیں بھی مجھ سے ہو جاتی ہیں۔ اب شیخ اس کا علاج کریگا۔ کیسا علاج کریگا؟ وہ ایسا علاج نہیں کریگا کہ اس کے نتیجے میں غصہ آنا بند ہو جائے گا، بلکہ علاج کے بعد بھی غصہ تو آئے گا، کیونکہ غصہ ایک فطری صفت ہے جو ہر انسان کے اندر ہوتی ہے، لیکن علاج کے نتیجے میں وہ غصہ شریعت کے تابع ہو جائے گا۔

اسی طرح نفس کے اندر جتنے بھی رذائل ہیں، چاہے وہ غصہ ہو یا شہوت ہو یا بخل ہو، یہ سب فطری ہیں، اور یہ صفات اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر اس لئے رکھی ہیں تاکہ انسان ان کو صحیح محل پر استعمال کرے، اگر انسان کے اندر غصہ نہ ہو تو وہ اپنی جان کا دفاع کیسے کریگا؟ مال کا دفاع کیسے کریگا؟ اپنے بیوی بچوں کا دفاع کیسے کریگا؟ غصہ نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ کوئی اس پر حملہ آور ہو یا اس کے بیوی بچوں پر حملہ آور ہو، مگر اس کو غصہ ہی نہیں آئے گا، دوسرے کے اس غلط اقدام کو روکنے کے لئے طبیعت میں کوئی محرک ہی نہ ہوگا، نہ اپنے نقصان سے

نہ بچنے کا کوئی تقاضا بیدار ہو گا۔

ایک نواب کا واقعہ

جیسے میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک نواب صاحب ہر کام ضابطے میں کیا کرتے تھے، ان کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے اپنا ایک ضابطہ بنا رکھا تھا کہ اتنے بجے سے اتنے بجے تک فلاں کام کروں گا، اتنے بجے سے اتنے بجے تک فلاں کام کروں گا، فلاں وقت کھانا کھاؤں گا، فلاں وقت سوؤنگا، فلاں وقت اٹھونگا۔ اور جس کام کے لئے جو وقت مقرر کر رکھا تھا، اس کے بارے میں ان کا کہنا یہ تھا کہ میں اس وقت ضابطے میں یہ کام کر رہا ہوں، چاہے وہ کام نہ کر رہے ہوں۔ مثلاً سونے کا وقت چھ گھنٹے مقرر کیا ہے، اور یہ طے کیا ہوا ہے کہ مجھے صبح ٦ بجے اٹھنا ہے، اب اگر پانچ بجے آنکھ بھی کھل جائے گی تب بھی وہ چھ بجے تک لیٹے رہیں گے، اگرچہ اس وقت وہ حقیقت میں تو نہیں سو رہے ہیں، لیکن ضابطے میں سو رہے ہیں۔

ایک دن نواب صاحب کے اٹھنے کا وقت ٦ بجے تھا، مگر ۵ بجے آنکھ کھل گئی، اب ضابطے میں وہ سو رہے تھے، اس وقت گھر میں ایک بندر گھس آیا، وہ بندر نواب صاحب کے کپڑے لیکر بھاگ گیا، پھر دوبارہ آکر روٹی لیکر بھاگ گیا، پھر کچھ اور سامان لیکر بھاگ گیا، مگر نواب صاحب لیٹے لیٹے بندر کو دیکھ رہے ہیں، جونہی چھ بجے تو فوراً ہڑبڑا کر اٹھے، اور کہنے لگے کہ ارے بھائی! کوئی دیکھنے والا نہیں ہے، یہ بندر سب چیزیں اٹھا کر لیجا رہا ہے، کیا سب لوگ مر گئے ہیں؟ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ جناب! آپ نے بندر کو لیجاتے ہوئے خود دیکھا تھا؟ کہنے لگے ہاں! ہم نے خود لیجاتے ہوئے دیکھا تھا۔ تو پھر جناب آپ ہی بندر کو روک دیتے، نواب

صاحب نے کہا: ارے بھائی! ہم اس وقت ضابطے میں سو رہے تھے۔ اب دیکھئے کہ اس ضابطے کو اس درجہ اپنے اوپر لاگو کر لیا کہ انسان کے جو فطری جذبات ہوتے ہیں کہ انسان اپنے جان اور مال کا دفاع کرے، وہ بھی اس ضابطے کے آگے قربان ہے۔

غصہ کو بر محل استعمال کرنا

اللہ تعالیٰ نے یہ غصہ اور غیرت اس لئے پیدا کی ہے کہ اگر دوسرا شخص تمہارے مال پر، تمہاری جان پر، تمہارے بیوی بچوں پر، تمہارے اعزہ اقرباء پر زیادتی کرے تو آدمی اس غیرت اور غصّے کو کام میں لا کر اس کا دفاع کرے۔ مگر اس غصے کا حد سے زیادہ ہونا یہ ہے کہ جہاں غصہ کا محل نہیں تھا، آدمی وہاں غصہ کرے، جہاں شریعت نے غصہ استعمال کرنے کو منع کیا تھا، اگر وہاں پر آدمی غصہ کرے۔ ڈانٹ ڈپٹ کرے، مار پیٹ کرے، یہ اس کا غلط استعمال ہے، یہ جائز نہیں۔ بہر حال، غصّے کے کچھ جائز محل ہیں اور کچھ ناجائز محل ہیں، جائز محل میں غصّے کا استعمال کوئی بری بات نہیں، بلکہ عین مطلوب ہے، مثلاً کوئی باپ اپنے بیٹے کو اس کی غلط بات پر ڈانٹے، یا استاد شاگرد کو ڈانٹے، یا شیخ مرید کو ڈانٹے، تاکہ اس کی خراب بات دور ہو جائے، تو یہ غصہ عین مطلوب ہے، بلکہ ایسے محل پر غصہ نہ کرنا مرض اور بیماری ہے۔ لیکن اگر وہ غصہ اپنی حد سے متجاوز ہو جائے، مثلاً ایک آدمی آپ سے ملنے کے لئے آیا، آپ نے اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا، ارے بھائی! وہ آنے والا تو مہمان تھا اور مہمان کا اکرام کرنا چاہئے تھا، اس کی خاطر کرنی چاہئے تھی، لیکن آپ نے اس کو الٹا ڈانٹنا شروع کر دیا، یہ مذموم ہے اور غلط ہے اور قابل اصلاح ہے۔

بہر حال، غصّے کو جائز حدود میں استعمال کرانا اور ناجائز حدود سے اس کو بچانا، بس یہی شیخ کا کام ہے لہٰذا جب تمہارے اندر غصہ تو ہے مگر تمہیں یہ پتہ نہیں کہ میں اس کو غلط استعمال کرتا ہوں یا صحیح استعمال کرتا ہوں، تو اب اپنے شیخ کو اپنے حالات اور معاملات بتادو، وہ خود تشخیص کردینگے اور صحیح وغلط کا فیصلہ کردیں گے، اور اگر خود ہی کو اپنے غصہ کے بے جا ہونے کا اندازہ ہے تو ایسے واقعات اور اپنے غصہ کے شدید ہونے کو اپنے شیخ سے بتادو کہ میرے اندر غصہ شدید ہے، پھر شیخ رفتہ رفتہ اس کی تدبیریں بتائے گا کہ تم کس طرح اس غصہ کو قابو میں لاؤ، اور کس طرح اس غصے کو صحیح استعمال کرو، تم اس کی بتائی ہوئی تدبیروں پر عمل کرلو۔

حسد کے علاج کی ضرورت

یا مثلاً طبیعت کے اندر "حسد" کی بیماری ہے، اب آدمی اپنے شیخ کو بتائے کہ میرے اندر "حسد" ہے، میرا فلاں ساتھی ہے جب امتحان میں اس کے نمبر زیادہ آتے ہیں اور میرے نمبر کم آتے ہیں تو اس وقت میرے دل میں ایک کڑھن پیدا ہوتی ہے، اور دل یہ چاہتا ہے کہ اس کے نمبر کم ہو جائیں۔ اب شیخ سے پوچھے کہ یہ صورت "حسد" ہے یا نہیں؟ اگر "حسد" ہے تو اس کا کس طرح علاج کروں؟ کیا طریقہ اختیار کروں؟

شہوت کے علاج کی ضرورت

یا مثلاً "شہوت" ہے، اگر یہ "شہوت" حد اعتدال سے بڑھی ہوئی ہے تو شیخ کو بتائے کہ میرے اندر یہ بیماری ہے، اس کا کیا علاج کروں؟ یا مثلاً دوسروں کے بتانے سے یا آپ خود ہی اپنے اندر یہ محسوس کررہے ہیں کہ میرے اندر بڑائی اور

تکبر ہے، یہ "تکبر" ایسی بیماری ہے کہ عموماً خود انسان کو اس کے بارے میں پتہ نہیں چلتا، چنانچہ دیکھ لیجئے کہ کبھی کوئی "متکبر" اپنے آپ کو متکبر نہیں کہے گا، اگر کوئی دوسرا ابھی اس سے پوچھے کہ تو تکبر کرتا ہے؟ تو وہ یہی جواب دیگا کہ میں تو تکبر نہیں کرتا، لیکن دوسرے شخص کو پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کے اندر تکبر ہے۔ لہٰذا شیخ کو بتلائے کہ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ میرے اندر تکبر ہے، یا فلاں عمل سے مجھے خود اپنے اندر "تکبر" کا شبہ ہو رہا ہے، اس کا علاج بتائیں کہ کیا علاج کروں؟

لہٰذا شیخ کے پاس جانے کا منشا یہ نہ ہو کہ ان سے وظائف اور اذکار پوچھ لیا کروں گا کہ کتنا ذکر کروں؟ کتنی تسبیح پڑھا کروں؟ کیا کیا معمولات اختیار کروں؟ کیونکہ یہ ذکر و اذکار، وظائف اور تسبیحات تو اس راستے کے لئے معین ہیں، لیکن خود مقصود اصلی نہیں، مقصود اصلی اس طریق کا یہ ہے کہ اپنی صبح سے شام تک کی زندگی کا جائزہ لیتا رہے، اور یہ دیکھے کہ میں نے جو فلاں کام کیا تھا، اس میں کہیں تکبر تو شامل نہیں ہو گیا؟ فلاں کام کے اندر غصے کا ناجائز استعمال تو نہیں ہوا تھا؟ فلاں کام میں نے طمع اور حرص کی وجہ سے تو نہیں کیا تھا؟ یا میرے اندر حبِّ مال اور حبِّ جاہ تو نہیں ہے؟ ان تمام چیزوں کا جائزہ لیتا رہے اور شیخ کو اطلاع کرتا رہے اور ان کا علاج پوچھتا رہے، اور شیخ جو علاج بتائے اس پر عمل کرتا رہے۔ اور اگر اس علاج پر عمل در آمد میں کوتاہی یا دشواری ہو تو وہ بھی شیخ کو بتائے۔ غرضیکہ اصلاح حال کے لئے اپنی ہر کیفیت سے اپنے مصلح اور شیخ کو باخبر کرتا رہے۔

اطلاع اور اتباع

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ جب

کسی شیخ سے رجوع کرے تو دو کام کرے، ایک "اطلاع" دوسرے "اتباع" "اطلاع" کے معنی یہ ہیں کہ اپنے حالات کی شیخ کو اطلاع کرے، اور "اتباع" کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ شیخ ہدایت دے اس کی اتباع کرے اور اس کی پیروی کرے، اس پر عمل کرے، اسی طریقے سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے۔

آج ہم نے "تصوف اور طریقت" کو ایک رسم بنالیا ہے کہ ہم فلاں صاحب سے بیعت ہیں، بس آگے کچھ نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کرلیا کہ شیخ نے جو کچھ معمولات اور کچھ مخصوص تسبیحات بتادیں کہ فجر کے بعد یا کسی اور وقت کو مقرر کرکے ان کو پڑھ لیا کرو، وہ پوری کرلیں، بس اس سے آگے کچھ نہیں، حالانکہ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ رذائل کی اصلاح کے بغیر تو یہ اذکار بعض اوقات مضر ہو جاتے ہیں، اس کی مثال یہ ہے کہ جب تک کوئی آدمی بیمار ہو، اس کو بیماری کی حالت میں مقویات یعنی طاقت کی دوائیں نہیں دی جاتیں، مثلاً شدید نزلہ یا بخار ہو رہا ہے تو اطباء کہتے ہیں کہ پہلے اس نزلہ اور بخار کا علاج کراؤ، اس حالت میں کوئی قوت بخش "خمیرہ" نہیں دیا جائے گا، کیونکہ طب کا اصول یہ ہے کہ جب آدمی کے اندر کوئی "خلط" غالب آجاتی ہے تو اس حالت میں انسان جو غذا بھی کھائے گا وہ غذا اس "خلط" کی طرف مستحیل ہو جاتی ہے، مثلاً اگر "بلغم" غالب ہے تو اس حالت میں جو مقویات اور غذا کھائے گا وہ سب بلغم کی طرف مستحیل ہو جائے گی۔ لہٰذا پہلے اس بیماری کا اور اس خلط کا علاج کیا جائے گا، پھر مقویات دی جائیں گی تو وہ مقویات کارآمد ہوں گی۔

اسی طرح اگر دل میں تو تکبر اور انانیت کا اور تعلّی کا بت بسا ہوا ہے اور اس حالت میں وہ ذکر کر رہا ہے، تو اپنے اس عمل کے نتیجے میں بعض اوقات وہ تکبر کی بیماری اور زیادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ اب یہ سمجھے گا کہ دیکھو میں کتنا بڑا اللہ والا

ہوں کہ اس طرح ذکر کر رہا ہوں، اور جو کام بڑے بڑے صوفیاء کرام نے کئے تھے وہی کام میں کر رہا ہوں۔ لہٰذا اس ذکر سے اسے فائدہ ہونے کے بجائے اس کی تکبر کی بیماری کو اور زیادہ تقویت حاصل ہو گی، اس لئے عام طور پر ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ آدمی پہلے اپنے رذائل دور کرائے۔

"رذائل" کے فطری ہونے کی دلیل

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"رذائل" کے فطری ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کو بھی غصہ آتا ہے، اور محققین کا قول ہے کہ "غضب" "کبر" سے پیدا ہوتا ہے، پھر "غضب" سے غیبت پیدا ہوتی ہے، جب بچوں میں "غصہ" ہے تو معلوم ہوا کہ ان میں "کِبر" بھی ہے، تو بچوں کے اندر ان امور کے ہونے سے معلوم ہوا کہ یہ امور فطری ہیں"۔

(انفاسِ عیسیٰ ص ۱۳۷)

بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ "رذائل" فطری ہیں، اور فطری ہونے کی وجہ سے اس فکر میں مت رہنا کہ یہ "رذائل" کبھی جا کر ختم ہو جائیں گے، نہیں، یہ ختم نہیں ہونگے، نہ غصہ ختم ہو گا اور نہ تکبر کی اصل ختم ہو گی، البتہ ان "رذائل" کو مضمحل کیا جائے گا، ان کو پیٹا جائے گا، کوٹا جائے گا، کچلا جائے گا، یہاں تک کہ ان کے اندر سے وہ زہر نکل جائے جو تمہارے لئے قاتل ہے۔ اسی کی تشریح آگے خود حضرت والا فرما رہے ہیں کہ:

زوال "رذائل" سے مقصود اضمحلال ہے

زوال "رذائل" سے مقصود اضمحلال ہے، اور "اضمحلال" کے

معنی یہ ہیں کہ مجاہدہ کے بعد اخلاق رذیلہ کی مقاومت میں پہلی جیسی مشقت نہ رہے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۷)

یعنی "رذائل" بالکلیہ زائل نہیں ہو سکتے، بلکہ ان کو ضعیف اور کمزور کر دیا جاتا ہے، ایسے کمزور ہو جاتے ہیں کہ ان کا مقابلہ کرنے میں جو مشقت پہلے ہوتی تھی، اب اتنی مشقت نہیں ہوتی۔ دنیا کے ہر کام میں بھی یہی معاملہ ہے اور دین کے ہر کام میں بھی کہ جو کام مشکل ہوتا ہے، مشق کے نتیجے میں وہ کام آسان ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو جب تک پانچ وقت نماز پڑھنے کی عادت نہیں تھی، تو اس کو نماز کے لئے مسجد کی طرف جانا اور نماز کی پابندی کرنا بہت شاق گزرتا تھا، اس کو بہت تکلیف ہوتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ جب نماز پڑھنے کی عادت پڑ گئی تو اب نماز پڑھنے کی مشقت کم ہو گئی۔ بالکلیہ مشقت تو ختم نہیں ہو گی، تھوڑی بہت مشقت کرنی پڑتی ہے، نفس کی مخالفت کرنی پڑتی ہے، لیکن عادت پڑنے سے وہ مشقت پہلے کی بنسبت کم ہو گئی۔ اور نماز پڑھنے پر جو ثواب ملتا ہے وہ درحقیقت اسی مشقت کا انعام ہے، اگر مشقت بالکل نہ رہے تو پھر ثواب کس چیز کا؟ اس لئے نماز پڑھنے میں کچھ مشقت اور محنت ہر حالت میں کرنی پڑتی ہے۔

یہی معاملہ خلاقِ رذیلہ کا ہے۔ مثلاً غصہ ہے، پہلے یہ حال تھا کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا، ذرا سی طبیعت کے خلاف کوئی بات ہوئی، بس پارہ آسمان پر چڑھ گیا اور دوسروں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ شروع کر دی۔ پھر جب اپنی اصلاح کرانے کے لئے تصوف اور طریقت کے راستے پر چلا تو پتہ چلا کہ غصہ بری چیز ہے اور غصہ کو بے محل استعمال کرنا گناہ ہے، چنانچہ اس نے اپنے غصہ کو روکا اور غصہ کا کڑوا گھونٹ پیا، دل چاہ رہا ہے کہ اس شخص کو زور سے تھپڑ ماروں، اس کے ٹکڑے کر دوں، لیکن اپنے آپ کو قابو کیا، اور اس قابو کرنے میں

بہت دقت اور مشقت ہوئی، پھر آہستہ آہستہ غصہ کو دباتے دباتے بالآخر یہ حال ہوا کہ اب غصہ تو آتا ہے، لیکن اس کے روکنے میں پہلی جیسی مشقت نہیں ہوتی۔

شہوت کا امالہ

یا مثلاً "شہوت" ایک رذیلہ ہے، اگر انسان اس کو غلط جگہ پر استعمال کرے تو اللہ تعالیٰ بچائے، یہ بہت خطرناک چیز ہے اور اس طریق میں یہ مہلک ہے، مثلاً شہوت کے تقاضے سے کسی ناجائز جگہ پر نظر ڈالنا، لذت لینے کے لئے نامحرم کو دیکھنا، نفس کو اس کی عادت پڑی ہوئی تھی، جب نفس کی اصلاح کے لئے تصوف اور سلوک میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو بہت گناہ کی بات ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہئے، چنانچہ اس کے بعد جب وہی منظر سامنے آیا تو دل میں شدید تقاضہ ہوا کہ خوب دل کھول کر اہتمام کے ساتھ اس کو دیکھا جائے جیسا کہ ہمیشہ سے دیکھتے چلے آئے تھے، لیکن یہ بات یاد آگئی کہ ہم تو اب نفس کی اصلاح کا کام شروع کر چکے ہیں، لہٰذا ہمیں اپنی نگاہ کو سنبھالنا ہوگا، نگاہ کو پست کرنا ہوگا، جب یہ خیال آیا تو نظر اس غلط جگہ سے ہٹالی تو اس وقت نفس پر قیامت گزر گئی، دل پر آرے چل گئے، اس لئے کہ اب تک تو غلط جگہ پر نگاہ ڈالنے کی عادت پڑی ہوئی تھی، اب وہاں سے نظر ہٹانے میں نفس کو شدید مشقت ہوئی، لیکن ایک مرتبہ یہ تہیہ کر لیا کہ چاہے دل پر آرے چلیں، قیامت ٹوٹے، کچھ بھی ہو، لیکن میں یہ کام نہیں کروں گا۔

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں برباد ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

یہ سوچ کر نظر کو وہاں سے ہٹالیا، تو جتنی مشقت پہلی مرتبہ ہوئی تھی، دوسری مرتبہ جب یہ واقعہ پیش آئے گا تو پہلی مرتبہ کے مقابلے میں مشقت کچھ کم ہوگی، تیسری مرتبہ جب پیش آئے گا تو اور کم مشقت ہوگی، چوتھی مرتبہ اور کم ہوگی، اس طرح کم ہوتے ہوتے وہ مشقت گھٹتی چلی جائے گی اور آخر میں جب طبیعت اعتدال پر آجائے گی تو اس کے بعد جب نگاہ غلط جگہ پر پڑے گی تو اس وقت اگرچہ نفس کا ہلکا تقاضا تو پھر بھی رہے گا، لیکن اس تقاضے کے باوجود اس نظر کو وہاں سے ہٹالینا اتنا دشوار نہیں ہوگا، اس لئے کہ بار بار نظر ہٹاتے رہنے سے مادے میں اضمحلال ہوگیا۔ اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زوال رذائل سے مقصود اضمحلال ہے، اور اضمحلال کے معنی یہ ہیں کہ مجاہدہ کے بعد اخلاق رذیلہ کی مقاومت (یعنی ان کا مقابلہ کرنے) میں پہلی جیسی مشقت نہ رہے" البتہ تھوڑی سی مشقت پھر بھی رہے گی۔ کتنا ہی انسان مجاہدے اور ریاضتیں کرکے اپنے آپ کو انتہا تک پہنچادے، تب بھی شہوت کا مادّہ ختم نہیں ہوگا، غضب کا مادہ ختم نہیں ہوگا، اور گناہ کے تقاضے بالکلیہ ختم نہیں ہونگے، گناہ کی جھلکیں پھر بھی آئیں گی، تقاضے پھر بھی پیدا ہوں گے، داعیے پھر بھی آئیں گے، البتہ فرق اتنا ہوگا کہ پہلے اس داعیہ کا مقابل کرنے میں بہت دقت ہوتی تھی، اب دقت کم ہوجائے گی۔

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آگے فرماتے ہیں:

"ورنہ مجاہدہ سے نہ حریص کی حرص زائل ہوتی ہے، نہ بخیل کا بخل، نہ متکبر کا کبر، ہاں اضمحلال ہوجاتا ہے"۔

یعنی طبیعت میں حرص کا جو اصل مادہ ہے، وہ ختم نہیں ہوتا، اگر طبیعت میں بخل کا مادہ ہے تو وہ ختم نہیں ہوتا، اگر طبیعت میں "تکبر" ہے تو وہ ختم نہیں ہوتا،

لیکن 'اضمحلال" ہو جاتا ہے۔ اضمحلال کا مطلب یہ ہے کہ یہ سارے مادّے اور ساری چیزیں اندر موجود تو ہیں، لیکن مجاہدے کے نتیجے میں وہ ایسی کمزور ہو گئی ہیں کہ اب وہ غلط کام پر انسان کو آمادہ نہیں کرتیں اور ان کے تقضٰی پر انسان عمل نہیں کرتا۔

حرص کا امالہ

مثلاً مال کی حرص انسان کی طبیعت میں موجود ہے، خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ﴾ (سورۃ آل عمران) لیکن اگر یہ "حرص" صحیح جگہ پر استعمال ہو تو یہ اتنی بری بھی نہیں۔ مال کی اتنی حرص جس کی انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لئے ضرورت ہے اور اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے اور ان کے حقوق ادا کرنے کے لئے جتنے حرص کی ضرورت ہے، اتنی حرص تو ہونی چاہئے۔ لیکن ایک وہ حرص ہے جس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر انسان کو ایک وادی سونے کی مل جائے تو وہ یہ حرص کریگا کہ دوسری وادی بھی مل جائے، اور جب دوسری وادی مل جائے گی تو یہ حرص کریگا کہ تیسری وادی مل جائے اور آدم کے بیٹے کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ یہ حرص حرام ہے، کیونکہ جب مال کی یہ حرص انسان پر غالب آجاتی ہے تو یہ انسان کو جائز ناجائز ہر طریقے سے پیسے حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہے،

حرص کے درجات

پھر حرص کے کچھ درجات ہیں، پہلا درجہ یہ ہے کہ وہ حرص انسان کو ایسے

طریقوں سے دولت حاصل کرنے پر آمادہ کرے جو کھلے طور پر ناجائز اور حرام ہیں، مثلاً وہ حرص اس کو چوری کرنے پر امادہ کرے کہ چوری کر کے دولت حاصل کرو، ڈاکہ پر انسان کو آمادہ کرے کہ ڈاکہ ڈال کر دولت حاصل کرو، یا دھوکہ دینے پر آمادہ کرے کہ دوسروں کو دھوکہ دے کر دولت حاصل کرو۔ اللہ بچائے! یہ حرص کا انتہائی درجہ ہے۔

حرص کا دوسرا درجہ

حرص کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ حرص اس کو دولت حاصل کرنے کے لئے کھلے حرام طریقے اختیار کرنے پر تو آمادہ نہیں کر رہی ہے لیکن وہ حرص اس کو تاویل اور توجیہ کر کے مال حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ حرص کا یہ درجہ عام طور پر مولوی صاحبان کے اندر ہوتا ہے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے، کیونکہ کسی مولوی صاحب کو اگر اس کا نفس یہ کہے کہ تو چوری کر لے، یا ڈاکہ ڈال لے، یا فلاں کا حق دبا لے تو وہ مولوی اس کی بات نہیں مانے گا اور کہے گا کہ یہ تو برا اور ناجائز کام ہے، میں تو نہیں کرتا، لیکن مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے، وہ شیطان آکر اس کو طرح طرح کی دلیلیں اور تاویلیں سناتا ہے کہ دیکھو یہ تمہارا حق ہے، اس کو تم وصول کرلو، حالانکہ حقیقت میں وہ اس کا حق نہیں بن رہا تھا، مگر اسی جذبہ "حرص" نے تاویل پر آمادہ کیا، اور اس تاویل کے نتیجے میں وہ ناجائز پیسے حاصل کر رہا ہے۔ حرص کا یہ درجہ بھی حرام ہے۔

حرص کا تیسرا درجہ

حرص کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ پیسے اچھے لگتے ہیں، اور دل میں یہ خواہش ہے

کہ پیسے زیادہ سے زیادہ آجائیں، لیکن اس خواہش کے نتیجے میں وہ شخص نہ تو کسی صریح حرام کام کا ارتکاب کرتا ہے اور نہ ہی مال حاصل کرنے کے ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے، نہ ہی تاویل اور توجیہ اختیار کرتا ہے، بس اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حلال اور جائز طریقہ سے دیدیا اس کو بخوشی لیا ہے اور مزید حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے، تو حرص کا یہ درجہ مذموم نہیں کیونکہ اس حرص نے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور نہ اس حرص کے مقتضیٰ پر کوئی ناجائز عمل کیا۔

بخل ایک بیماری ہے

یہی حال "بخل" کا ہے، خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:
﴿وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس میں بخل کا مادّہ رکھا ہے، اسی وجہ سے انسان کو پیسوں سے کچھ نہ کچھ محبت ہوتی ہے، لیکن جب تک یہ بخل کسی فریضے کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ بنے اور اس بخل کے نتیجے میں کوئی ایسا کام نہ ہو جو یا تو حرام ہے یا مکروہ ہے یا خلاف مروّت ہے، تو وہ بخل مذموم نہیں ہے، ہاں اگر وہ شخص بخل کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں دیتا یا بخل کی وجہ سے اپنے بیوی بچوں کا جتنا نفقہ واجب ہے وہ نہیں دیتا، یا بخل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا، یا بخل کی وجہ سے وہ فقیروں کی طرح رہتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دولت دی ہے، پیسے دئے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا یہ حق ہے کہ انسان اس کو اس طرح استعمال کرے کہ دیکھنے والے کو بھی پتہ چلے کہ یہ شخص کوئی بھیک منگا اور فقیر نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ یُرٰی اَثْرَ نِعْمَتِہٖ عَلَیْہٖ"
یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ بندے کو اس نے جو نعمت دی ہے،

اس کا اثر بھی اس پر ظاہر ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا اظہار ہونا چاہئے، یہ نہ ہو کہ وہ ہے تو لکھ پتی آدمی، لیکن پھٹے پرانے کپڑے پہنے پھر رہا ہے، کیونکہ یہ بھی ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے، جب اللہ تعالیٰ نے نعمت دی ہے تو اس کو استعمال کرنے سے اس کا اظہار بھی ہونا چاہئے، اس دولت کو اس طرح استعمال کرے کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ اللہ تعالیٰ کی فلاں نعمت اس کو حاصل ہے۔

بخل کی ایک صورت

بخل کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی حقوق واجبہ تو ادا کر رہا ہے، لیکن اس طرح ادا کر رہا ہے کہ گھر میں روزانہ دال روٹی پکواتا ہے، حالانکہ اس کے پاس اتنی وسعت ہے کہ اپنے گھر والوں کے لئے اچھے اور عمدہ کھانے کا انتظام کر سکے۔ یہ بھی بخل کے اندر داخل ہے البتہ یہ بخل خلافِ مروّت ہے۔

لیکن اگر بخل کے نتیجے میں کوئی حق واجب نہیں چھوٹ رہا ہے، بلکہ اطمینان اور فراغت کے ساتھ بیوی بچوں کے حقوق ادا کر رہا ہے، مگر پیسہ خرچ کرتے ہوئے طبیعت پر تھوڑی سی گرانی ہوتی ہے اور دل کو تکلیف ہوتی ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، حالانکہ یہ بھی بخل کی ایک صورت ہے، لیکن بخل کے تقاضے پر عمل نہیں ہوا اور اس بخل نے کسی غلط کام پر آمادہ نہیں کیا، اس لئے یہ بخل کچھ مضر نہیں۔ لہٰذا ''مجاہدہ'' کے نتیجے میں یہ بخل زائل نہیں ہوتا، نہ حرص زائل ہوتی ہے، لیکن ان کا نقصان ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ پھر ان کے تقاضوں پر عمل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رزائل سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

آمین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

تیسری مجلس

مجاہدہ اور ریاضت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تیسری مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین، والعاقبة للمتقین، والصلوٰة والسلام علی رسوله الکریم وعلی آله وأصحابه اجمعین أما بعد!

ریاضت اور مجاہدہ کا ایک فرق

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ایک درجہ تو ہے تقاضائے معصیت کا، اس کی مخالفت کرنا تو "مجاہدہ" ہے، اور ایک اس تقاضا کا منشاء ہے "خلق رذیل" اس کے ازالہ بمعنی اضمحلال کو "ریاضت" کہتے ہیں"۔

تصوف اور سلوک کی کتابوں میں آپ اکثر "مجاہدہ" اور "ریاضت" کی اصطلاح پڑھتے ہیں، لیکن "مجاہدہ" کسے کہتے ہیں؟ اور "ریاضت" کسے کہتے ہیں؟ اور دونوں کے درمیان فرق کیا ہے؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں ان دونوں کا مطلب اور ان کے درمیان فرق کو بیان فرمایا ہے۔

فرمایا کہ "مجاہدہ" تو یہ ہے کہ جب نفس کسی کام کا تقاضا کر رہا ہے کہ یہ کام کرو، اب زبردستی نفس کو اس کام سے روکنا "مجاہدہ" ہے۔ اور "ریاضت" کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کے داعیے کا جو منشاء تھا، بار بار مجاہدہ کرنے کے نتیجے میں اس منشاء پر ضرب لگی، اس ضرب لگنے کے نتیجے میں وہ کمزور ہو گیا اور اضمحلال ہو گیا۔ تو یہ "ریاضت" ہے۔

جائز چیزوں کا ترک

گناہ سے بچنے کے لئے بعض اوقات انسان کو کچھ جائز چیزیں بھی ترک کرنی پڑ جاتی ہیں، ایک کام بذات خود جائز ہے لیکن کبھی اس کو بھی اس لئے چھوڑنا پڑتا ہے کہ کہیں یہ نفس اس جائز کام سے بالآخر کسی ناجائز کام کی طرف لیجانے والا نہ بن جائے۔ مثلاً بعض اوقات صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ کھانا بھوک سے کم کھاؤ، اب بتایئے کہ بھوک کے مطابق کھانا کھانا کوئی گناہ ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ گناہ نہیں، اس کے باوجود فرماتے ہیں کہ کم کھاؤ، کیوں؟ اس لئے کہ کم کھانے کے نتیجے میں یہ تمہارے نفس کا مجاہدہ ہو گا اور مجاہدہ کا اثر یہ ہو گا کہ نفس کو تقاضوں کے خلاف کام کرنے کی عادت پڑے گی جو معصیت کے تقاضے کی خلاف ورزی کرنے میں کام آئے گی۔

کم کھانے کا مجاہدہ

مثال کے لئے میں نے کم خوراکی کے مجاہدے کی بات ذکر کی ہے، تاہم ہمارے زمانہ میں خاص اسی چیز کا مجاہدہ کرنے کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کم کھانے کا جو مجاہدہ پہلے زمانے کے صوفیاء کرام کرایا

کرتے تھے، وہ آج کل مفید نہیں۔ کیونکہ پہلے زمانے کے لوگوں کے قوی مضبوط ہوا کرتے تھے اور خوراکیں زیادہ ہوا کرتی تھی، اس میں کمی کرنا بنیادی صحت کے لئے نقصان دہ نہیں ہوتا تھا بلکہ نفس کو قابو میں رکھنے کا ذریعہ ہو جاتا تھا، لیکن یہ کم خوراکی بھی انہی کے حساب سے تھی چنانچہ "احیاء العلوم" میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کم کھانے کی جو مقدار لکھی ہے، وہ آج کے دور میں مجھ جیسے دو آدمی کھالیں۔ اس لئے ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کے دور میں کم کھانے کی مقدار یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق کھالے اس سے زائد نہ کھائے، اور اس کی پہچان کا طریقہ یہ ہے کہ کھانے کے دوران ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ آدمی کو یہ کشمکش ہوتی ہے کہ مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ اس وقت کھانا چھوڑ دے، بس آج کل کم خوراکی کے لئے اتنا مجاہدہ کرلو۔ اب بتایئے کہ اگر اس مرحلے پر کوئی شخص ایک دو نوالے اور کھالے تو کیا وہ ایک دو نوالے کھانا گناہ ہے؟ کوئی ناجائز ہے؟ نہیں، جائز ہے، لیکن اس کو مزید کھانے سے جو روکا جارہا ہے، وہ مجاہدہ کی وجہ سے روکا جارہا ہے۔

بہر حال، صوفیاء کرام بعض اوقات جائز چیزوں سے ابھی اس لئے روک دیتے ہیں تاکہ نفس کو مجاہدہ کا عادی بنایا جائے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! یہ صوفیاء کرام بہت سی ایسی چیزوں سے بھی منع کردیتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، یہ کیوں حرام کردیتے ہیں؟ مثلاً اللہ تعالیٰ نے کھانا حلال کیا تھا، صوفیاء کہتے ہیں کہ مت کھاؤ، سونا حلال کیا ہے، صوفیاء کہتے ہیں کہ مت سوؤ، لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت کرنے کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، صوفیاء کہتے ہیں کہ بات چیت کم کرو، اس کی کیا وجہ ہے؟

انسان کے نفس کا مثال

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کاغذ لیا اور فرمایا کہ اس کاغذ کو ایک طرف موڑو، پھر فرمایا اس کاغذ کو سیدھا کرو، لیکن بار بار سیدھا کرنے کے باوجود یہ کاغذ سیدھا نہیں ہوتا، جو سلوٹ اس میں پڑ گئی ہے وہ اسی طرف اس کاغذ کو موڑ رہی ہے۔ اس کو سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کاغذ کو دوسری طرف الٹی سمت میں موڑ دو، اب یہ کاغذ سیدھا ہو جائے گا۔

پھر فرمایا کہ انسان کا نفس بھی گناہ کی طرف مڑا ہوا ہے، جب اس کو تم اعتدال پر لانا چاہتے ہو تو یہ اعتدال پر نہیں آتا، اس لئے اس نفس کو دوسری طرف موڑو، اور اس نفس سے جائز اور حلال چیزیں بھی چھڑاؤ، جب اس سے جائز چیزیں چھڑاؤ گے تو بالآخر اس کے اندر اعتدال پیدا ہو جائے گا اور پھر گناہ سے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے محفوظ رہے گا۔ یہ ہمارا نفس گناہوں کا عادی بنا ہوا ہے، العیاذ باللہ۔ ہماری نگاہ بد نظری کی عادی بنی ہوئی ہے، ناجائز چیزوں پر نگاہ ڈالنے اور ان سے لذت حاصل کرنے کی عادی بنی ہوئی ہے، جب کہ قرآن کریم میں فرمایا کہ ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ آپ مؤمنوں سے فرمادیں کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں۔ اگر بازار جاتے ہوئے آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے بھالتے جاؤ گے تو یہ جائز ہے یا ناجائز ہے؟ جائز ہے۔ کیونکہ جب سامنے وہ چیزیں نظر آرہی ہیں جن کا دیکھنا جائز ہے، مثلاً بلڈنگ نظر آرہی ہے، سڑک نظر آرہی ہے، کاریں آتی جاتی نظر آرہی ہیں، ان سب کو دیکھنا جائز ہے، لیکن نگاہ چونکہ گناہ کی عادی بنی ہوئی ہے اور گناہ کی چیز کو بار بار دیکھنے کے تقاضے پیدا ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا سدِ باب کے لئے اور حفظ ماتقدم کے طور پر فرمایا کہ جب بازار میں چلو تو نگاہ

نیچی کر کے چلو، کیوں؟ اس لئے کہ جب تم جائز چیزوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھو گے تو ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ بالآخر حرام پر نگاہ پڑ جائے گی، اور یہ تمہارا دل، تمہارا نفس کمزور ہے، گناہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور اگر نیچے نگاہ کر کے چلو گے تو محفوظ رہو گے۔

نگاہ کی حفاظت کا طریقہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو راندۂ درگاہ کیا تو شیطان نے قسم کھا کر کہا کہ آپ مجھے راندۂ درگاہ کر رہے ہیں، تو اب میں انسان کے پاس بہکانے کے لئے دائیں طرف سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا۔ شیطان نے چار سمتوں کو تو بیان کر دیا لیکن دو سمت بھول گیا، ایک اوپر کی سمت اور ایک نیچے کی سمت، اس کا مطلب یہ ہے کہ اوپر اور نیچے کی سمت شیطان کی پہنچ سے محفوظ ہے۔ اگر اپنی نگاہ کو دائیں طرف کرو گے تو شیطان بہکا سکتا ہے، بائیں طرف کرو گے تو بھی شیطان بہکا سکتا ہے، سامنے اور پیچھے کرو گے تو بھی شیطان آکر بہکا سکتا ہے، لیکن اگر اوپر یا نیچے کرو گے تو شیطان نہیں بہکا سکتا، البتہ اگر نگاہ اوپر کر کے چلو گے تو گرو گے، لہٰذا ایک ہی راستہ ہے کہ نگاہ نیچے کر کے چلو تو پھر شیطان کے تصرفات سے انشاء اللہ محفوظ ہو گے۔

یہ مجاہدہ ہو رہا ہے، اس میں مقصود تو یہ ہے کہ نامحرم پر لذت لینے کی غرض سے نگاہ ڈالنے سے بچنا، لیکن پہرہ پہلے بٹھا دیا کہ نیچے دیکھو، دائیں بائیں نہ دیکھو، یہ مجاہدہ ہے، اس مجاہدہ کے بعد جب انسان اس بات کا عادی ہو جائے گا کہ اس کی نگاہ غیر محرم پر پڑے گی ہی نہیں، اور اگر کسی وقت پڑیگی تو فوراً ہٹالی جائے گی تو ایسی

صورت میں پھر دائیں اور بائیں طرف دیکھنے میں کچھ مضائقہ نہیں، سب کچھ دیکھو، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو دیکھنا حلال کیا ہے، وہ سب دیکھنا جائز ہے۔ بہر حال، بعض اوقات حرام سے بچنے کے لئے حلال کو چھوڑنا پڑ جاتا ہے، اسی کا نام مجاہدہ ہے۔

مجاہدات کا نتیجہ

ان مجاہدات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے باطن میں جو "خلق رذیل" ہے وہ مہذب ہو جاتا ہے، مثلاً مال کی محبت تھی لیکن مجاہدہ کے نتیجے میں وہ محبت مہذب ہو گئی، دنیا کی محبت تھی لیکن مجاہدہ کے نتیجے میں مہذب ہو گئی، شہوت تھی مگر مجاہدہ کے نتیجے میں مہذب ہو گئی، غصہ تھا مگر مجاہدہ کے نتیجے میں مہذب ہو گیا۔ اب جب ان رذائل کی تہذیب ہو گئی تو اسی کا نام "ریاضت" ہے۔

لیکن ان "رذائل" کے مہذب ہونے کے باوجود ان کی دیکھ بھال ہر وقت ضروری ہے، یہ نہ ہو کہ بس ایک مرتبہ ان کو مہذب بنا کر فارغ ہو گئے تو اب چھٹی ہو گئی، نہیں، اس کی چھٹی نہیں ہوتی، آخر دم تک چھٹی نہیں ہوتی۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جنم روگ ہے، زندگی بھر کی بیماری ہے کہ آدمی ہر وقت اس بات کا دھیان رکھے کہ کہیں کوئی کام غلط تو نہیں ہو رہا ہے، کہیں گڑبڑ تو نہیں ہو رہی ہے۔ کیونکہ مجاہدہ کے نتیجے میں یہ رذائل فنا نہیں ہوتے بلکہ کمزور پڑ جاتے ہیں، کسی وقت بھی ان کے اندر جان آجائے تو انسان کو گناہ کے اندر مبتلا کر دے اس لئے ہر وقت دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اندریں راہ می تراش و می خراش
تا دم آخر دمے فارغ مباش

یعنی اس راستے میں ہر وقت تراش خراش کرنی پڑتی ہے، آخر دم تک ایک لمحے کے لئے بھی فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا۔

تجدید معالجہ کی ضرورت

آگے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ:

"مادہ کا استیصال جب تک نہ ہو، تجدید معالجہ کی ضرورت رہے گی، اور استیصال کی تدبیر نہیں" (انفاس عیسیٰ ۱۳۸)

اگر کسی چیز کا مادہ بالکل ختم نہ ہو تو وہ مادہ کسی بھی وقت اپنا اثر دکھا سکتا ہے۔ اس لئے علاج معالجے کی تجدید کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، یہ مت سمجھو کہ جب ہم شیخ کے پاس گئے، اس نے مجاہدات کرائے، اصلاح کی، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حالات بہتر ہو گئے، برائیوں کی طرف رغبت اتنی زیادہ نہ رہی اور برائیوں سے بچنے کا اہتمام ہو گیا۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ اب دوبارہ برائیوں کی طرف عود ہی نہیں ہو گا، نہیں، بلکہ دوبارہ عود ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کو ایک مثال سے سمجھا رہے ہیں کہ:

"موسمی بخار کا نسخہ پینے کے بعد کیا پھر آئندہ فصل میں بخار نہ ہو گا؟ وہ کونسی تدبیر ہے کہ صفرا ہی پیدا نہ ہو، اور اگر ایسا کیا جائے گا تو بہت منافع جو خلط صفراء سے متعلق ہیں، وہ فوت ہو جائیں گے۔ اسی طرح مادہ شہوانی میں بہت منافع ہیں"۔

یعنی تمہیں جب موسمی بخار آیا تو تم ڈاکٹر کے پاس گئے، اس نے تمہیں نسخہ لکھ دیا کہ یہ نسخہ استعمال کرو، تم نے وہ نسخہ استعمال کر لیا اور تمہارا بخار اتر گیا، لیکن کیا اس بات کی کوئی گارنٹی ہے کہ وہ بخار دوبارہ نہیں آئے گا؟ کوئی ڈاکٹر کوئی حکیم

اس کی گارنٹی دے سکتا ہے کہ ایک دفعہ کے علاج کے بعد آئندہ بخار نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر نے بس اتنا کام کر دیا کہ جو تمہارا بخار اس وقت موجود تھا، اس کا علاج کر دیا، اب آئندہ بخار نہ آئے، اس کے لئے خود تمہیں کچھ احتیاط اور پرہیز کرنا پڑے گا، اور اس احتیاط اور پرہیز کے باوجود پھر بھی بخار آجائے تو کچھ بعید نہیں، لیکن جب دوبارہ بخار آجائے تو دوبارہ ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ اور اس سے کہو کہ یہ پھر بخار آگیا ہے، دوا دیدیں، وہ پھر دوا دیدے گا، دوا پینے کے بعد پھر ٹھیک ہو جاؤ گے۔

اسی طرح شیخ کے پاس جاکر اپنے کسی ایک رذیلے کا علاج کرالیا اور علاج ہو گیا، اور وہ رذیلہ زائل ہو گیا تو اب یہ مت سمجھو کہ چھٹی ہو گئی اور اب وہ رذیلہ کبھی دوبارہ نہیں لوٹے گا، نہیں، وہ دوبارہ لوٹ سکتا ہے، لہٰذا جب وہ رذیلہ دوبارہ لوٹے تو دوبارہ شیخ کے پاس چلے جاؤ اور علاج کرالو۔

اخلاق رذیلہ کی صفائی بار بار کرتے رہو

ایک مرتبہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے عرض کیا کہ حضرت! یہ عجیب معاملہ ہے کہ جب تک آپ کی خدمت میں اور آپ کی صحبت میں رہتے ہیں تو طبیعت میں بڑی پاکیزگی اور صفائی محسوس ہوتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اخلاق رذیلہ نکلے جاچکے ہیں، اور گناہوں سے نفرت محسوس ہوتی ہے اور نیکیوں کی طرف رغبت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جب واپس اپنے گھر جاتے ہیں تو پھر وہی گناہوں کے تقاضے اور خواہشات پھر شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کا کیا کریں؟ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے، میں تو دھوبی ہوں، جب تمہارے کپڑے میلے ہو جائیں، یہاں اٹھا کر لے آؤ، میں دھو

دو نگا، لیکن جب ایک مرتبہ کپڑے دھل گئے تو کوئی دھوبی اس بات کی گارنٹی نہیں دیتا کہ یہ کپڑے آئندہ میلے نہیں ہونگے، دھوبی نے کپڑے دھودیے اور صاف ستھرے کر کے تمہیں دیدیے کہ ان کو پہن لو، اب ہفتہ دس دن کے بعد جب دوبارہ میلے ہو جائیں پھر دھوبی کو دیدو وہ پھر دھودیگا۔

لہٰذا یہ نہ سمجھو کہ بات ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی بلکہ تجدید معالجہ کی ضرورت رہتی ہے، یعنی بار بار رجوع کرنے اور علاج کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ اور یہ جتنے مشائخ ہوتے ہیں جن کو بیعت کرنے کی اجازت دیدی جاتی ہے، ان کے بارے میں یہ مت سمجھو کہ وہ ایسے کامل ہو گئے کہ اب ان سے کوئی غلطی نہیں ہوگی اور وہ خطا سے معصوم ہو گئے یا اب ان کے اندر گناہ کا تقاضہ پیدا نہیں ہوگا۔ نہیں، بلکہ ان کے اندر بھی گناہوں کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں، ان سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں، لیکن چونکہ نفس کے اندر ایک صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اور اخلاق کی تہذیب ہو گئی ہے، اس لئے فوراً تنبّہ ہو جاتا ہے، اور اس تنبّہ کے بعد خود ان کو بھی اپنا معالجہ کرنا پڑتا ہے، خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے اندر ایسی کوئی بیماری دیکھتا ہوں تو اس کا خود سے علاج کرتا ہوں۔

لیکن چونکہ ان حضرات کی طبیعت، ان کا مزاج، ان کے اخلاق مزکّی اور مجلّی ہو چکے ہوتے ہیں، اس لئے خود ہی بیماری کو پہچان لیتے ہیں اور خود ہی علاج کر لیتے ہیں۔ بخلاف ہم جیسے ایک عام آدمی کے، ہمیں علاج کے لئے معالج کے پاس جانے کی ضرورت پڑتی ہے، انکے پاس جا کر اپنے حالات بیان کرنے کی اور ان سے ہدایات لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا اصلاح معالجہ آخر دم تک جاری رہتا ہے، بڑے بڑے اولیاء اللہ کو بھی یہی حالت پیش آتی ہے۔

تم انسان ہو فرشتے نہیں

اگر انسان کے اندر گناہ کرنے کے جذبے اور تقاضے نہ ہوتے تو پھر تم میں اور فرشتے میں کیا فرق رہ جاتا، فرشتے کے اندر یہ تقاضے موجود نہیں، نہ ان کے اندر غضب ہے، نہ ان کے اندر شہوت ہے، نہ ان میں خواہشات نفس ہیں، نہ ان کے اندر بھوک پیاس ہے، کچھ بھی نہیں ہے، اب اگر تمہارے اندر سے بھی یہ چیزیں ختم ہوجائیں تو تم فرشتے بن گئے، اب تمہاری ان پر کوئی فضیلت نہیں رہی، تمہاری فضیلت اسی وجہ سے ہے کہ تمہارے اندر اچھائی کے ساتھ برائی کا مادہ رکھا گیا ہے، اور اس بُرائی کے مادّے کے مقابلے کی وجہ سے تم فرشتوں سے آگے بڑھ جاتے ہو۔

معصوم تھا، نہ وقفِ سجود ودعا تھا میں
خوبی میری یہی تھی کہ اہلِ خطا تھا میں

فرشتے معصوم بھی ہیں اور وقفِ سجود ودعا بھی ہیں۔ اور انسان کی خوبی یہی ہے کہ اس کے اندر خطا کرنے اور گناہ کرنے کا مادہ موجود ہے، اس کے بعد وہ اس مادّے سے مقابلہ کر کے اللہ کے لئے گناہ سے بچتا ہے۔ یہ خوبی خود یہ چاہتی ہے کہ مادہ موجود رہے، اور جب یہ مادّہ رہے گا تو کشاکشی بھی رہے گی، البتہ یہ ہوگا کہ شروع میں یہ کشاکشی بہت زور کی ہوتی ہے اور مجاہدوں کے بعد ہلکی ہو جاتی ہے، لیکن یہ ہلکی ہلکی کشاکشی آخر دم تک باقی رہے گی، اس کشاکشی سے نہ تو گھبراؤ اور نہ مایوس ہو اور نہ اس سے غافل ہو کر بیٹھو۔

خلاصہ یہ ہے کہ مجاہدہ کے ذریعہ اپنے نفس کے تقاضوں کو کچلنا تاکہ وہ اعتدال پر آجائیں اور کسی ناجائز کام پر آمادہ نہ کریں یہ کام مرتے دم تک جاری

رہنا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے زیادہ کشاکشی ہوتی تھی، بعد میں کم ہوتی چلی جائے گی۔

تمام اخلاق رذیلہ کا علاج

فرمایا:

"تمام اخلاقِ رذیلہ کا علاج تأمل اور تحمل ہے یعنی جو کام کرے سوچ کر کرے کہ شرعاً جائز ہے یا نہیں اور جلدی نہ کرے۔ بلکہ تحمل سے کیا کرے" (انفاس عیسیٰ ص ۱۳۸)

اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان اخلاقِ رذیلہ کے علاج کے لئے دو کام کرے، ایک تأمل، دوسرے تحمل۔ تأمل کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کرے غور کر کے اور سوچ کر کرے کہ جو کام کر رہا ہوں شرعاً جائز ہے یا نہیں اور جو بات میں کہہ رہا ہوں یہ جائز ہے یا ناجائز؟ اگر تأمل کے نتیجے میں پتہ چلا کہ جس کام کا میں نے ارادہ کیا ہے وہ ناجائز ہے اور ناجائز ہونے کے باوجود نفس اس کی طرف مائل ہو رہا ہے، تو پھر اب تحمل سے کام کرے یعنی اس کام کو چھوڑنے پر جو مشقت ہو رہی ہے اس کو برداشت کرے اگر انسان یہ دو کام کرتا رہے تو تمام رذائل قابو میں آجائیں گے۔

یہ کام ہماری طاقت سے باہر نہیں

اس بیان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہ بہت مشکل راستہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کا ہمیں اور آپ کو مکلّف کیا ہے وہ کبھی ہماری برداشت سے باہر نہیں ہو سکتا، لہٰذا گناہوں سے بچنے کی فکر اور سوچ اور اس پر آنے والی تکلیف کو

برداشت کرنا شروع کردو، یہ کام کرتے کرتے کبھی پھسل بھی جاؤ گے، کبھی غلطی بھی ہو جائے گی، اور تمہارے اور نفس کے درمیان کشاکشی ہوتی رہے گی، تمہارے اور شیطان کے درمیان ایک دوسرے سے کشتی چلتی رہے گی، کبھی شیطان اور نفس تمہیں چت کر دیگا اور کبھی تم اس کر چت کر دو گے۔ جب تم اس کو چت کر دو تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور کہو "الحمد للہ" اور اگر وہ تمہیں چت کر دے تو استغفار کرو اور کہو "استغفر اللہ" پھر کچھ عرصہ کے بعد یہ ہوگا کہ تم اس کو زیادہ چت کرو گے اور وہ تمہیں کم چت کریگا، تم زیادہ غالب رہو گے، قرآن کریم کی آیت: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ سے بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔

بچہ کس طرح بڑا ہوتا ہے

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ آپ نے چھوٹے بچے کو دیکھا کہ وہ کس طرح بڑا ہو جاتا ہے اور پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کس طرح بڑا ہو رہا ہے، اگر وہ بچہ روزانہ اپنے آپ کو ناپے اور یہ دیکھے کہ میں آج کتنے انچ بڑا ہوا، تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ میں تو بڑا ہی نہیں ہوا، جیسا کل تھا ویسا ہی آج ہوں۔ اگلے دن پھر ناپتا ہے کہ اب میں کتنا بڑا ہوا تو پھر ویسا کا ویسا ہی پاتا ہے، لیکن حقیقت میں بڑھوتری ہو رہی ہے اور بڑا ہو رہا ہے لیکن وہ بڑھوتری غیر محسوس ہے، اور ہوتے ہوتے وہ بالغ اور جوان ہو گیا اور ڈاڑھی نکل آئی اور پورا آدمی بن گیا۔ اسی طرح جب آدمی اس راستے پر چلتا ہے بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ چلے اور لگا رہے، چھوڑے نہیں اور غافل نہ ہو تو دھیرے دھیرے اس کی ترقی ہوتی رہتی ہے۔

اور یہ بتدریج ترقی ہی بہتر ہے، کیونکہ اگر ایک آدمی ایک دم سے اپنے اندر

ایسا انقلاب لے آئے جس کے نتیجے میں اس کی طرف انگلیاں اٹھنے لگے کہ فلاں آدمی کیا سے کیا بن گیا، یہ بعض اوقات فتنے کی نشانی ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے وہ فتنے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لئے تدریج کے ساتھ دھیرے دھیرے جو انقلاب آتا ہے، اسی میں بہتری ہے، اسی میں خیر ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت ہوتی ہے۔ لہٰذا مایوس ہو کر مت بیٹھو، لگے رہو، اس راستے چلتے رہو، نفس وشیطان کے ساتھ لڑائی لڑتے رہو، یہاں تک کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

چوتھی مجلس
اصلاحِ باطن کا طریقہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

چوتھی مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم، وعلى آله واصحابه اجمعين، امابعد!

اصلاح اعمال واصلاح باطن کا طریقہ

فرمایا کہ:

"اعمال کی اصلاح اور باطن کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے اور اس کو مشقت کا عادی بنایا جائے"۔

"اعمال کی اصلاح" سے مراد ہے "اعمالِ ظاہرہ کی اصلاح۔ یعنی وہ اعمال جو ظاہری اعضاء سے سرزد ہوتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔ اور "باطن کی اصلاح" سے مراد باطن کے وہ اعمال ہیں جو انسان کے دل سے سرزد ہوتے ہیں، جیسے صبر، شکر، توکل، تواضع وغیرہ۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ چاہے اعمال ظاہرہ کی اصلاح کا معاملہ ہو یا باطن کی اصلاح کا معاملہ ہو، دونوں کا طریقہ یہ

ہے کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے، دل میں جو غلط جذبہ اور غلط داعیہ پیدا ہو رہا ہے، زبردستی اس کی مخالفت کی جائے اور اس کو مشقت کا عادی بنایا جائے۔

شیخ کا ایک نظر ڈالنا

لوگ سمجھتے ہیں کہ جب کسی اللہ والے کے پاس آدمی جاتا ہے یا کسی شیخ کی خدمت میں حاضری دیتا ہے اور اس سے اصلاحی تعلق قائم کرتا ہے اور اس سے بیعت ہوتا ہے تو وہ اپنی نظر سے کام بنا دیتے ہیں، شیخ نے ایک نظر ڈال دی تو بس دل کی دنیا بدل گئی۔

خوب سمجھ لیں کہ اصلاح نفس کے لئے یہ کوئی معمول کا طریقہ نہیں ہے، لہٰذا یہ نہیں ہوگا کہ کوئی اللہ والا نظر ڈال دیگا تو تمہاری طبیعت بدل جائے گی اور تمہارے حالات میں خود بخود انقلاب آجائے گا، بلکہ کرنا تو خود ہی پڑے گا۔ ہمت کرنی ہوگی، کوشش کرنی ہوگی، مشقت اٹھانی ہوگی، شیخ کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ توجہ دلا دے اور راستہ بتا دے، ایسی تدبیریں بتا دے جس کے ذریعہ کام نسبتاً آسان ہو جائے، لیکن کرنا خود ہی پڑے گا، چلنا خود ہی پڑے گا کوئی شخص یہ سوچے کہ مجھے خود کچھ کرنا نہ پڑے، بلکہ دوسرا آدمی مجھے منزل تک پہنچا دے، تو یہ بات نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو پھر انبیاء کرام علیہم السلام کو اشاعت دین کے لئے مجاہدات اور مشقت اٹھانے کی ضرورت نہ ہوتی، بس لوگوں پر ایک نظر ڈال دیتے اور سب لوگ مسلمان ہو جاتے۔

اللہ تعالیٰ نے ایسا معاملہ نہیں کیا، کیونکہ ہر انسان کو جزا اور سزا اس کے اپنے عمل پر دی جائے گی، لہٰذا عمل تو اسی کو کرنا ہے، اور عمل کرنے کے لئے ہمت

چاہئے، عزم اور پختہ ارادہ چاہئے کہ چاہے اس راستے میں کتنی بھی مشقت ہو، پھر بھی یہ کام کروں گا۔ لہٰذا اعمال کی اصلاح اور باطن کی اصلاح کے لئے بھی ضروری ہے کہ خود ہمت کرے اور دل میں جو غلط جذبات پیدا ہو رہے ہیں ان کی مخالفت کرے، اور ہمت کر کے ان کا مقابلہ کرے، اور اپنے آپ کو اس مشقت کے اٹھانے کا عادی بنائے۔

حاصل تصوف

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کا ایک ملفوظ بہت کثرت سے نقل فرمایا کرتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ وہ ملفوظ پورے تصوف اور طریقت کا عطر اور خلاصہ ہے، فرماتے تھے کہ:

> "وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جب کسی طاعت کے ادا کرنے میں سستی ہو تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو انجام دے، اور جب کسی گناہ سے بچنے میں نفس سستی کرے تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے، بس اسی سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، اسی سے ترقی کرتا ہے، اور اسی سے تعلق باقی رہتا ہے"۔

یہ وہ بات ہے جو ایک مجدد تصوف اور طریقت جس نے اس طریق کے سارے دفتر چھان مارے، اس راستے کی خاک چھانی، وہ کہہ رہا ہے کہ سارے تصوف کا حاصل یہ ہے کہ سستی کا مقابلہ کرو، مثلاً نماز پڑھنے میں سستی ہو رہی ہے اور دل چاہ رہا ہے کہ مسجد میں نہ جاؤ، گھر میں ہی نماز پڑھ لو یا نماز کی چھٹی کر لو، اب اس سستی کا علاج سوائے چستی کے اور کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا سستی کے مقابلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو ہمت دی ہے اس کو استعمال کرو، جب ہمت

کو استعمال کروگے تو سستی زائل ہوگی، اگر ہمت کو استعمال نہیں کروگے تو یہ سستی تمہارے اوپر اور قبضہ جماتی چلی جائے گی، کیونکہ اس سستی کا حال یہ ہے کہ تم جتنا اس کے سامنے ہتھیار ڈالو گے یہ اتنی ہی تمہارے اوپر قابو پائے گی، آج تم سے ایک فرض چھڑا لیا، کل کو دوسرا فرض چھڑائے گی، آج ایک گناہ کرا لیا، کل کو دوسرا گناہ کرا دے گی۔ اور اگر تم اس کے مقابلے میں ڈٹ گئے اور اپنے آپ کو مضبوط کر لیا کہ مجھے یہ کام نہیں کرنا یا مجھے یہ کام ضرور کرنا ہے تو پھر یہ سستی کمزور پڑتی چلی جائے گی۔

انسان کا نفس بچے کی طرح ہے

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے "قصیدہ بردہ" میں کیا خوبصورت بات فرمائی ہے، فرمایا:۔

النفس کالطفل إن تهمله شبَّ علی
حُبِّ الرضاع وان تفطمه ینفطم

یعنی انسان کا نفس چھوٹے بچے کی طرح ہے، اگر تم بچے کو دودھ پلاتے رہو گے اور کبھی نہیں چھڑاؤ گے تو وہ بچہ جوان ہو جائے گا اور دودھ پیتا رہے گا، لیکن اگر ایک مرحلے پر تم یہ محسوس کرو کہ اب دودھ پلانا اس کے لئے مضر ہے، اسے چھڑا دینا چاہئے تو اس وقت دودھ چھڑانے کے لئے تھوڑی سی دقت اور مشقت ضرور ہوگی، وہ بچہ روئے گا، چیخے گا، چلائے گا، راتوں کو خود جاگے گا اور تمہیں بھی جگائے گا، لیکن بالآخر وہ دودھ چھوڑ ہی دیگا۔ اور اگر تم اس مشقت سے گھبرا گئے اور کہا کہ بچے کو دودھ چھڑانا تو بہت مشکل ہے، یہ رات کو خود بھی نہیں سوئے گا اور مجھے بھی نہیں سونے دیگا، چلو دودھ پلاتے رہو، اس صورت

میں وہ بچہ جوان ہو جائے گا لیکن اس کی شیر خواری نہیں جائے گی۔

اسی طرح تمہارا نفس بھی بچے کی طرح ہے، اس کو تو گناہوں کی لت لگی ہوئی ہے، اس کو تو معصیتوں اور نافرمانیوں کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس کو مزہ اسی میں آتا ہے کہ نافرمانی کرے گناہ کرے، اور طاعت سے بچے، اب اگر تم نے اس کو اسی معصیت اور گناہوں پر لگائے رکھا اور کہا کہ چل تو گناہ کا دودھ پےتارہ، تو یہ نفس کبھی بھی گناہ نہیں چھوڑے گا، اور اگر کبھی تم نے اس سے گناہ چھڑانا چاہا تو اس وقت مشقت ضرور ہوگی لیکن بالآخر وہ گناہ چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے گا اور گناہ چھوڑ دے گا۔ بس اس نفس کو تھوڑی سی مشقت اور مشق کرانے کی دیر ہے۔

یہ علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کا عجیب و غریب پیغام ہے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ تصوف کا حاصل بھی یہی ہے کہ سستی کا مقابلہ کرکے آدمی طاعت کو کرے اور سستی کا مقابلہ کرکے معصیت سے بچے۔

ہمت بڑی چیز ہے

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر سستی پیدا فرمائی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ایک اور چیز پیدا فرمائی ہے، وہ ہے "ہمت" یہ ہمت بڑی عجیب و غریب چیز ہے، اور اس کی مثال ربڑ ہے، اگر ربڑ کو تم کھینچو گے تو وہ کھینچتی چلی جائے گی، اسی طرح انسان کے اندر جو ہمت ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ اس کو جتنا چاہو کھینچ لو اور اونچے سے اونچے مقام تک پہنچ جاؤ۔ اس دنیا کے اندر جس شخص نے بھی کوئی کارنامہ انجام دیا ہے وہ اسی ہمت کی بنیاد پر انجام دیا ہے، چاہے وہ دنیا کا کارنامہ ہو یا دین کا کارنامہ ہو، چاہے وہ فضول اور لغو کارنامہ ہو۔ فضولیات اور لغویات کے کارنامے بھی ہمت ہی سے انجام پاتے ہیں۔

نیاگرہ آبشار اور مہم جوئیاں

امریکہ میں ایک مشہور آبشار ہے "نیاگرہ" دنیا کے عجائبات میں اس کا شمار ہے۔ ایک مرتبہ میرا وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو ایک صاحب نے وہاں پر ایک کتابچہ لاکر دیا، اس کتابچے میں اس آبشار کے تاریخی واقعات لکھے تھے کہ اس "نیاگرہ آبشار" پر کیا کیا عجائب و غرائب پیش آئے ہیں اور لوگوں نے یہاں کیا کیا کارنامے انجام دیے ہیں اور کیا کیا مہم جوئیاں کیں۔ اس آبشار میں پورا دریا اوپر سے نیچے بڑی قوت سے گرتا ہے۔ چنانچہ اس کتابچہ میں لکھا تھا کہ کن کن لوگوں نے یہاں یہ کارنامہ انجام دیا کہ وہ ایک ربڑ کی کشتی میں بیٹھے اور آبشار کے دھانے پر کشتی لاکر کشتی سمیت اس آبشار کے ذریعہ نیچے گرتے تھے۔ چنانچہ اس میں لوگوں کے مقابلے ہوئے کہ کون جلدی گرتا ہے اور کون دیر لگاتا ہے، اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کی جانیں چلی گئیں، اور اس کے ذریعے یہ ریکارڈ قائم کرنا تھا کہ ہم "نیاگرہ آبشار" کے ساتھ ساتھ اپنی کشتی کو گرا کر لے گئے۔

بہت سے لوگوں نے یہاں یہ مقابلہ کیا کہ "نیاگرہ آبشار" کی چوڑائی میں رسّا باندھا اور پھر اس رسّے پر چل کر اس آبشار کو عبور کر رہے ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے عبور کرنے کی کوشش کی لیکن درمیان میں گر پڑے اور گرنے کے نتیجے میں جسم کے ٹکڑے ہو گئے، کیونکہ جس رفتار سے پانی اوپر سے نیچے گرتا ہے اس میں اگر کوئی جاندار آکر گرے تو اس کی ہڈی پسلی ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ کوشش کے نتیجے میں بعض لوگوں نے عبور کر لیا اور اپنا ریکارڈ قائم کر لیا۔ اس کے بعد پھر ایک شخص نے کہا کہ فلاں آدمی نے تو اس کو تنہا عبور کیا، میں ایک آدمی کو اپنے اوپر بٹھا کر رسّے پر چل کر اس آبشار کو عبور کرتا ہوں،

چنانچہ اس نے ایک اندھے آدمی کو سر پر بٹھا کر اس رسّے کے ذریعہ اس آبشار کو عبور کیا اور اپنا ریکارڈ قائم کیا، اور دنیا کی تاریخ میں آج تک اس کا نام لکھا ہوا ہے کہ فلاں شخص نے اس طرح "نیاگرہ آبشار" عبور کیا۔

اب بتائیے! کیا آپ یہ کام کر سکتے ہیں؟ نیاگرہ آبشار کیا، ایک چھوٹے سے نالے پر رسّی باندھ کر اس کو پار کرنے کی کوشش کریں؟ آپ سے نہیں بنے گا، لیکن جب ایک شخص نے ہمت کرلی کہ مجھے یہ کام کرنا ہے اور عزم کرلیا کہ میں یہ کام کرونگا تو اس نے کرلیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس ہمت میں ایسی قوت عطا فرمائی ہے کہ کافر غیر مسلم اور اللہ کو نہ ماننے والا بھی جب کسی کام کو کرنے کی ہمت کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ہمت میں بھی برکت عطا فرمادیتے ہیں اور اس کو رسّے پر چلا کر اس کا ریکارڈ قائم کرادیتے ہیں۔

نافرمانی سے بچنے کے لئے ہمت کرو

جب اللہ تعالیٰ ایک کافر کی ہمت میں یہ برکت عطا فرمادیتے ہیں تو ایک صاحب ایمان جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کے لئے ہمت کرے تو کیا اللہ تعالیٰ اس میں برکت نہیں دیگا؟ اس ہمت کو اللہ تعالیٰ نے اتنی قوت عطا فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ بڑے بڑے معرکے سر کرادیتے ہیں، بس عزم کرنے کی دیر ہے۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ انسان بے ہمتی اور سستی کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور پھر یہ سمجھتا ہے کہ میں بے بس ہوگیا، لیکن شریعت کا کہنا یہ ہے کہ تم کسی کے آگے بے بس نہیں ہو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (سورہ بقرہ پارہ نمبر ۳) لہٰذا جن کاموں کا تمہیں حکم دیا گیا ہے وہ تمہاری

وسعت میں ہیں، بس ہمت کرنے کی دیر ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سارے تصوف کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمت کر کے سستی کا مقابلہ کرے اور طاعات کو انجام دے اور معصیت سے بچے۔ پوری زندگی اس کام میں گزارنی ہے، اگر کسی وقت پھسل جاؤ تو پھر سے ہمت کو تازہ کرلو۔

بچہ کس طرح چلنا سیکھتا ہے

حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ آپ نے بچے کو دیکھا ہے کہ وہ کس طرح چلنا سیکھتا ہے؟ جب پہلی مرتبہ وہ چلنا چاہتا ہے تو ایک قدم چلتا ہے پھر گر پڑتا ہے، اب اگر وہ بچہ گرنے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جائے کہ چلنا میرے بس میں نہیں ہے تو کبھی اس کو چلنا نہیں آئے گا، لیکن اگر وہ دوبارہ چلے گا پھر گریگا اور گر کر پھر چلے گا پھر گریگا پھر چلے گا، یہاں تک کہ گرتے پڑتے چلتے چلتے بالآخر اس کو چلنا آجائے گا۔ لہٰذا ہمت کے ذریعہ اپنے آپ کو آگے بڑھاؤ، آگے قدم بڑھاؤ، جب گر جاؤ تو کوئی پرواہ نہ کرو، پھر دوبارہ کھڑے ہو کر چلنا شروع کردو، پھر گر گئے پھر اٹھ کر چلنا شروع کردو۔ آج دو مرتبہ گرے، کل کو ایک مرتبہ گرو گے، آج پورے گرے، کل کو آدھے گرو گے، رفتہ رفتہ چلنا آجائے گا۔ بہر حال، ہمت کے ذریعہ انسان آگے بڑھتا ہے اور ہمت کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ ہو گا وہ انسان کی ہمت سے ہو گا۔

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

یہ جو مشہور ہے کہ فلاں بزرگ ایک نظر ڈال دیتے ہیں تو زندگی بدل جاتی ہے، انقلاب آجاتا ہے۔ جیسا کہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ مشہور ہے کہ حافظ شیرازیؒ ابتداء میں ویسے ہی آوارہ پھرتے رہتے تھے، ان کے والد کے ایک

شیخ تھے، والد کی یہ خواہش تھی کہ یہ میرا بیٹا آوارہ پھرتا رہتا ہے اور شیخ کے پاس ملاقات اور اصلاح کرنے نہیں جاتا، اس کو چاہئے کہ شیخ کے پاس جا کر اصلاح کرائے۔ ایک دن شیخ ان کے گھر تشریف لائے، حافظ صاحب ویسے ہی پھر رہے تھے، باپ نے ان کو بلایا کہ ادھر آو، چونکہ شاعر تھے ہی، جب قریب آئے تو ایک شعر پڑھا کہ ؎

آں را کہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشم بما کنند

یعنی وہ لوگ جو ایک نظر سے خاک کو کیمیا بنادیتے ہیں۔ دراصل شیخ کو خطاب ہے کہ آپ تو ایک نظر میں خاک کو کیمیا بنادیتے ہیں، کاش ایک نظر کا کنارہ ہم پر بھی ڈال دیں۔ شیخ نے فوراً جواب دیا کہ "نظر کردم نظر کردم" میں نے نظر ڈال دی، میں نے نظر ڈال دی، بس اس وقت سے حافظ کی دنیا بدل گئی اور وہ آوارہ گردی ختم ہو گئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو صاحب مقامات بنادیا۔ بہرحال پچھلے زمانے کے صوفیاء کرام کے یہاں اس قسم کے چند واقعات ملتے ہیں کہ شیخ نے ایک نظر ڈالی اور ایک نظر سے زندگی میں انقلاب آگیا۔

نظر ڈال کر تصرف کرنے کی حقیقت

اس بارے میں کئی باتیں سمجھنے کی ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نظر ڈالنا "تصرف" ہے، اور یہ تصرف کرنا ہر ایک کو نہیں آتا، اور تصرف نہ آنا کوئی عیب کی بات نہیں، یعنی اگر کسی شیخ اور ولی اللہ کی نظر میں تصرف کی قوت نہ ہو تو اس کے اندر کوئی عیب نہیں، اگر تصرف کی یہ قوت حاصل ہو جائے تو اللہ کی نعمت ہے اور اگر حاصل نہ ہو تو کوئی عیب نہیں۔

آج کل ایک پیر صاحب بڑے مشہور ہو رہے ہیں، ان کی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا کہ "جو پیر اپنے مریدوں کو بیت اللہ میں نماز نہ پڑھوا سکے وہ پیر بیعت کے لائق نہیں" یاد رکھئے! یہ گمراہی کی فکر ہے، اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں، تصرف کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ تصرف کا عمل فاسق وفاجر کو بھی حاصل ہو جاتا ہے، حتی کہ کافر اور غیر مسلم کو حاصل ہو جاتا ہے، معلوم ہوا کہ یہ حالت مقرب بارگاہ خداوندی ہونے کی علامت نہیں اور نہ ہی یہ متقی ہونے کی علامت ہے، اور نہ اس کا نہ ہونا کوئی عیب ہے، بعض اوقات کسی کو تصرف حاصل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات نہیں ہوتا۔

تصرف کے ذریعہ وقتی نشاط پیدا ہوتا

دوسری بات یہ ہے کہ "تصرف" کا حاصل صرف یہ ہے کہ جس شخص پر تصرف کیا گیا ہے، تصرف کے نتیجے میں اس کی طبیعت میں ذرا سا نشاط پیدا ہو جاتا ہے، لیکن یہ نشاط دیرپا نہیں ہوتا بلکہ وقتی ہوتا ہے، آگے کام اس کو خود ہی کرنا پڑتا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ اس تصرف کے نتیجے میں ساری عمر کام کرتا رہے۔ اس تصرف کی مثال ایسی ہے جیسے گاڑی کو دھکا لگانا، اگر گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے تو اس کو دھکا لگا کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس دھکا لگانے کے نتیجے میں اس گاڑی میں چلنے کی تھوڑی سی صلاحیت پیدا ہوئی، لیکن جب دھکے کے ذریعہ اسٹارٹ ہو گئی تو اب وہ گاڑی انجن اور پیٹرول کی طاقت سے چلے گی، لیکن اگر انجن ہی خراب ہے یا پیٹرول ہی نہیں ہے تو پھر ہزار دھکے لگاؤ، گاڑی نہیں چلے گی۔ بس دھکا لگانے سے دو چار قدم چل کر کھڑی ہو جائے گی۔

بالکل اسی طرح اگر انسان کے اندر سلوک میں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں

چلنے کی ہمت اور طاقت ہے تو کسی کی نظر پڑ جانے سے اس کے اندر چلنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی اور طبیعت کے اندر ذرا سا نشاط پیدا ہو گیا، اب اگر اپنے اندر طاقت ہے تو وہ اس کے ذریعہ آگے چلے گا۔ لیکن اگر اندر ہی طاقت نہیں تو ہزار نظر ڈالتے رہو، ہزار تصرف کرتے رہو، کچھ نہیں ہو گا، ہاں وقتی طور پر تھوڑا سا جذبہ پیدا ہو گا پھر وہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

بہر حال، یہ "نظر" نہ تو دیرپا چیز ہے، نہ دائمی ہے، نہ ہر ایک کو حاصل ہوتی ہے، نہ کوئی ایسی صفت مدح ہے جس کا نہ ہونا عیب ہو۔ اور اگر نظر سے فائدہ ہو بھی جائے تو وہ وقتی ہو گا، آخر میں کام اپنی ہمت ہی سے کرنا ہو گا، انجن اپنا مضبوط کرنا ہو گا، اسی انجن سے ہی گاڑی چلے گی، دھکے سے نہیں چلے گی۔ لہٰذا اصل کام یہ ہے کہ اپنی ہمت کو تازہ کرو۔ اسی لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ "اعمال کی اصلاح اور باطن کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے اور اس کو مشقت کا عادی بنایا جائے"۔ اس کو جتنا مشقت کا عادی بناؤ گے وہ بنتا ہی چلا جائے گا اور اس کے نتیجے میں تمہارا کام بنتا چلا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ پھر اس سے ظاہری اعمال بھی درست ہوتے چلے جائیں گے اور باطن بھی درست ہوتا چلا جائے گا۔

حسن اخلاق کی بھی ایک حد ہے

آگے فرمایا کہ:

"حدیث میں ہے کہ جب تم سائل کو تین بار عذر سمجھا کر جواب دیدو اور وہ پھر بھی نہ جائے، لپٹ کر جم ہی جائے جس سے ایذاء ہونے لگے تو پھر اس کے جھڑک دینے میں کچھ ڈر نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا

کہ حسن اخلاق کی بھی ایک حد ہے اور بندہ اس کا مکلف نہیں کہ اس حد سے آگے ایذاء کا تحمل کرے" (انفاس عیسیٰ ص ۱۳۸)

ایک طرف قرآن کریم کا تو یہ ارشاد ہے کہ "وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ" یعنی جو سائل تم سے مانگ رہا ہو، اس کو مت جھڑکو اور ڈانٹ ڈپٹ کر مت بھگاؤ، اگر منع کرنا ہے تو نرمی سے منع کر دو کہ بابا معاف کرو، اس وقت دینے کو نہیں ہے، یا کوئی اور عذر ہے تو بتا دو، جھڑکنا نہیں چاہئے۔ لیکن اگر ایک مرتبہ سمجھا دیا کہ بابا اس وقت نہیں ہے، معاف کرنا، پھر بھی وہ مانگ رہا ہے پھر سمجھا دیا کہ بابا معاف کرو، پھر بھی وہ پریشان کر رہا ہے، پھر تیسری مرتبہ سمجھا دیا، تین مرتبہ سمجھانے کے بعد اب تم نرمی کرنے کے مکلّف نہیں ہو، اب اگر تم اس کو جھڑک دو کہ بھاگ یہاں سے، یہ جھڑکنا تمہارے لئے جائز ہے اور یہ جھڑکنا "اَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ" میں داخل نہیں ہوگا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ اس سے پتہ چلا کہ لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کی بھی ایک حد ہے، یہ نہیں کہ حسن اخلاق کا حکم انسان کو غیر متناہی تکلیف پہچانے کے لئے دیا گیا ہے، دوسرا شخص چاہے کتنی تکلیف پہنچائے مگر یہ برداشت ہی کرے اور حسن اخلاق ہی کا مظاہرہ کرے، ایسا نہیں ہے، بلکہ ایک حد کے بعد ظاہر اًبد اخلاقی کا مظاہرہ کرنا پڑے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ ہر چیز کی اللہ تعالیٰ نے ایک حد رکھی ہے، اسی حد تک وہ محمود بھی ہے اور مطلوب بھی ہے، اس حد سے آگے کا انسان مکلف نہیں۔

ابتداءً برمحل بھی غصہ نہ کرے

اگرچہ انسان کو حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہئے کہ وہ غصہ نہ کرے،

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ویسے تو بے محل غصہ کرنا گناہ ہے اور بر محل غصہ کرنا جائز ہے، لیکن بے محل غصہ کرنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس کی مشق کرنی پڑتی ہے کہ بر محل بھی غصہ نہ کرے۔ اور مبتدی کو تو چاہئے کہ پہلے تو غصہ بالکل چھوڑ ہی دے، نہ بر حق غصہ کرے، نہ ناحق غصہ کرے پھر جب غصہ قابو میں آجائے تو بر حق غصہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ بر حق غصہ کرنا جائز ہے وہ کوئی رذیلہ نہیں ہے۔

اب یہ دیکھنا کہ کس حد تک انسان حسن اخلاق سے پیش آئے، یہ وہ مقام ہے جہاں انسان دھوکہ کھا جاتا ہے، یہی وہ چیز ہے جو بزرگوں کی صحبت سے حاصل کی جاتی ہے کہ کس جگہ آدمی غصہ کرے اور کس جگہ غصہ نہ کرے۔ یہ کوئی ریاضی کا فارمولا نہیں ہے جو دو اور دو چار کر کے سمجھا دیا جائے کہ فلاں جگہ پر رک جاؤ اور فلاں جگہ پر غصہ کر لو، بلکہ بزرگوں کی صحبت کے نتیجے میں ایک ذوق اور ملکہ پیدا ہو جاتا ہے پھر اس ملکہ کے ذریعہ انسان فیصلہ کرتا ہے کہ یہاں پر غصہ کرنا صحیح ہے اور یہاں پر غصہ کرنا غلط ہے۔ اور یہ ملکہ صاحبِ ملکہ کی صحبت کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ صاحب کمال کو دیکھئے کہ وہ کس طرح عمل کر رہا ہے، اس کو دیکھنے سے اپنے اندر بھی وہ ملکہ رفتہ رفتہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ریاضت سے اصلاحِ اخلاق کے معنیٰ

فرمایا کہ:

"حدیث میں ہے کہ جب تم سنو کہ اپنی جگہ سے پہاڑ ٹل گیا تو تصدیق کر لو اور جب تم کسی شخص کی نسبت سنو کہ اپنے اخلاق سے ہٹ گیا تو

تصدیق مت کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ریاضت سے اخلاق جبلیہ زائل نہیں ہوتے، ہاں مضمحل ہو جاتے ہیں" (انفاس عیسیٰ ص ۱۳۹)

یہ مشہور حدیث ہے کہ اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ فلاں پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر فلاں جگہ چلا گیا ہے تو اس کی تصدیق کرنے کی گنجائش ہے، کیونکہ اس کا امکان ہے، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں شخص جبلی اور فطری اخلاق سے ہٹ گیا تو اس کی تصدیق مت کرو۔ مطلب یہ ہے کہ پہاڑ تو اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے لیکن اخلاقِ فطری اور جبلی اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے۔ جیسا کہ فارسی کی مثل مشہور ہے کہ "زمین جنبد زمان جنبد، نہ جنبد گل محمد" گل محمد سے مراد اخلاق جبلیہ ہیں، وہ اپنی جگہ سے نہیں ٹل سکتے۔

اس حدیث کو نقل کر کے حضرت والا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ ریاضت سے اخلاق جبلیہ زائل نہیں ہوتے، ہاں! مضمحل ہو جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ حدیث میں نفی اس بات کی کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس کا غصہ ختم ہو گیا تو اس کی تصدیق مت کرو، کیونکہ غصہ ختم نہیں ہوتا۔ البتہ ریاضت، مجاہدہ اور صحبت کے نتیجے میں غصہ مضمحل ہو جاتا ہے اور اب ہر جگہ غصہ نہیں آتا، بلکہ بر محل غصہ آتا ہے اور حد سے تجاوز نہیں کرتا لیکن وہ غصہ بالکلیہ ختم نہیں ہوتا۔

درحقیقت اس حدیث کو یہاں لانے کا منشا ان لوگوں کی تردید ہے جو اس حدیث کو بنیاد بنا کر یہ کہتے ہیں کہ صاحب! پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے لیکن اخلاق انسان کے نہیں بدل سکتے۔ یہ سن کر لوگ اصلاح سے مایوس ہو جاتے ہیں کہ جب میرے اخلاق نہیں بدل سکتے تو اصلاح کرانے سے کیا فائدہ؟ بس جیسے اخلاق ہیں ان کو ویسے ہی رہنے دیا جائے۔ حضرت نے اس حدیث کا صحیح مطلب

واضح فرمایا کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جبلی اخلاق نہیں بدل سکتے البتہ کمزور پڑ جاتے ہیں، اور کمزور پڑ جانے کے نتیجے میں برائی پر آمادہ کرنا ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ انسان اپنے اخلاق کی اصلاح کی کوشش ہی نہ کرے۔

پانچویں مجلس

بدنظری اور اس کا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔لیاقت آباد، کراچی ۱۹

پانچویں مجلس

بد نظری اور اس کا علاج

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين، والصلوٰة والسلام علی رسوله الكريم، وعلی آله واصحابه اجمعين اما بعد!

ایک صاحب نے اپنا حال لکھا کہ:

"شہوانی خیالات کا ہر وقت دل پر استیلاء رہتا ہے، نامحرموں کو بری نظر سے دیکھنے میں ذرا بھی باک نہیں"۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۳)

یہ ایک صاحب نے اپنا حال حضرت والا کو لکھ کر بھیجا، اور اصول یہ ہے کہ جب کسی شیخ سے تعلق ہو تو اس کو اپنی ہر بات لکھنی ضروری ہے، اگر وہ اس کو چھپائے اور شرمائے تو علاج کیسے ہو؟ جیسے ڈاکٹر اور طبیب سے اپنی بیماری نہیں چھپائی جاتی، اگر بیماری کو چھپائے گا تو علاج کیسے ہوگا؟ اسی طرح جب کسی شیخ سے اصلاحی تعلق ہو تو چاہے کتنی ہی شرمناک بات ہو، وہ شیخ پر ظاہر کرے تاکہ اس کا علاج ہو سکے، اور یہ خیال نہ کرے کہ شیخ کو یہ بات لکھوں گا تو اس کی نظر سے میری قدر کم ہو جائے گی، یا اس کے دل میں میرے بارے میں برائی پیدا ہوگی، اور شیخ کے دل میں برائی پیدا ہونا مرید کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! جب اللہ تعالیٰ کسی سے اصلاح کا کام لیتے ہیں تو اس کو اپنی مخلوق پر

رحمت اور شفقت عطا فرماتے ہیں، اگر کوئی شخص بری سے بری بات بھی شیخ کو لکھتا ہے تو شیخ کے دل میں اس کی طرف سے برائی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ شیخ کے دل میں رحم، ترس اور شفقت پیدا ہو جاتی ہے، جیسے ماں باپ کو دیکھا ہو گا کہ اگر ان کی اولاد میں کوئی بچہ بیمار یا معذور ہو تو ماں باپ کو تندرست بچے پر اتنی شفقت اور محبت نہیں ہوتی جتنی معذور اور اپاہج بچے پر ہوتی ہے، ساری دنیا اس بچے سے گھن کر رہی ہے لیکن ماں باپ اس پر فدا ہیں اور اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، اس کا پیشاب پاخانہ صاف کر رہے ہیں۔ اسی طرح شیخ کو بری بات لکھنے سے یہ مت سوچو کہ شیخ بد ظن ہو گا اور شیخ کا بد ظن ہونا میرے حق میں نقصان دہ ہو گا، بلکہ ایسے مرید سے اور زیادہ محبت اور شفقت پیدا ہوتی ہے، اس کی طرف اور زیادہ توجہ ہوتی ہے۔

مربی کے سامنے اپنا عیب ظاہر کرنا

بعض اوقات اہل علم کو ایک اشکال ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص اپنا عیب اور اپنا گناہ دوسرے پر ظاہر نہ کرے کہ میں نے فلاں وقت فلاں گناہ کیا تھا یا میں فلاں گناہ میں مبتلا ہوں یا فلاں باطنی بیماری میں مبتلا ہوں، اس کا اظہار دوسرے سے نہیں کرنا چاہئے۔ ہاں، اللہ تعالیٰ سے کرنا چاہئے کہ یا اللہ! میں اس گناہ میں مبتلا ہوں، مجھے اس گناہ سے نکال دیجئے۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تشریح میں فرمایا کہ یہ حکم غیر مربی کے لئے ہے، یعنی اپنے گناہ اور اپنی باطنی بیماریوں کا اظہار ہر کس و ناکس پر نہ کرے، البتہ وہ شخص جس مربی کی تربیت میں ہے، اس پر ضرور اس کا اظہار کرے، وہ اظہار اس حدیث کی نہی میں داخل نہیں۔ جیسے کسی انسان کے

سامنے کشفِ عورت جائز نہیں، لیکن طبیب کے سامنے ضرورۃً کشف عورت جائز ہے، اگر آپ کسی طبیب کے پاس علاج کے لئے گئے اور بیماری جسم کے اس حصے میں ہے جس کو چھپانا واجب ہے، یا بیماری تو کسی اور حصے میں ہے لیکن طبیب کے لئے علاج کی ضرورت کے لئے اس حصے کا دیکھنا ضروری ہے تو اس طبیب کے سامنے ستر کا کھولنا جائز ہے، اس لئے کہ علاج اس پر موقوف ہے۔

اسی طرح اپنے گناہ کا اظہار کسی دوسرے پر کرنا جائز نہیں کہ میں نے فلاں گناہ کیا تھا بلکہ اس گناہ کو چھپاؤ، اس لئے کہ وہ گناہ گندگی ہے، اس پر پردہ ڈال دو اور اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرو، خواہ مخواہ اس کا اظہار اور افشاء نہ کرو۔ لیکن مربی اور شیخ کے سامنے اس کا اظہار ضروری ہے تاکہ اس بیماری کا علاج اور اس کا ازالہ ہو سکے۔ لہٰذا جس کسی سے تربیت کا تعلق ہو، چاہے وہ ضابطے کا شیخ ہو، یا ضابطے کا شیخ تو نہ ہو بلکہ استاذ ہو اور اس کو اپنا مربی بنا رکھا ہو، یا باپ ہو اور وہ باپ بیٹے کی تربیت کر رہا ہو تو اس کے سامنے اپنی اس بیماری کا اظہار اس حدیث کی ممانعت میں داخل نہیں۔ اس اصول کے تحت ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ "شہوانی خیالات کا ہر وقت دل پر استیلاء رہتا ہے، نامحرموں کو بری نظر سے دیکھنے میں ذرا بھی باک نہیں"۔ مطلب یہ تھا کہ بدنظری میں مبتلا ہوں، کیا علاج کروں؟۔ چونکہ اس گناہ میں بکثرت ابتلاء ہوتا ہے، اس لئے حضرت والا کا یہ جواب بڑا جامع اور سب کے لئے مفید ہے۔

نظر بچانے کے لئے ہمت کی ضرورت

چنانچہ جواب میں ارشاد فرمایا کہ:

"یہ شر ایسا ہے کہ اپنے اثر سے تمام طاعات کے انوار کو تاریک کر دیتا ہے، اس لئے اس کا علاج اہتمام سے کرنا چاہئے، اور ظاہر ہے کہ یہ مادہ

خلقی ہے، پس وہ شر نہیں، بلکہ اس میں بہت سی مصالح ہیں، البتہ اس مادے کے اقتضا پر عمل کرنا شر ہے، اور وہ اختیاری ہے اور اختیاری کی ضد بھی اختیاری ہے، پس فعل سے رکنا اختیاری ٹھیرا، اس میں کوئی معذوری نہیں، پس ہمت کیجئے، یہی اس کا جواب ہے، چندے تکلف ہوگا، پھر عادت ہو جائے گی پھر لذت اور فرحت ہوگی"۔(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۳)

جب آدمی کسی بیماری میں مبتلا ہو تو پہلے اس بیماری کی کیفیت، اس کی شدت اور اس کے اثرات کا ادراک اور احساس کرے، پھر اس بیماری کے علاج کی فکر ہوگی، لیکن اگر بیماری کے بارے میں معلوم ہی نہیں کہ یہ بیماری کیسی شدید ہے تو پھر اس کا علاج کیا کریگا۔ اس لئے پہلے جملے میں حضرت والا نے بد نظری کی بیماری اور نگاہ کو غلط استعمال کرنے کی بیماری، نامحرموں پر لذت کی نظر سے دیکھنے کی بیماری کی شدت اور خطرناکی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ شر اینا ہے کہ اپنے اثر سے تمام طاعات کے انوار کو تاریک کر دیتا ہے"۔

بد نگاہی سے طاعت کے نور کا زوال

اس سے آپ اس گناہ کی شدت میں اندازہ لگائیں، آپ نے نمازیں بھی پڑھیں، تہجد پڑھے، تراویح بھی پڑھی، ذکر بھی کیا، تسبیحات بھی پڑھیں، ان طاعات اور عبادات سے جو نور اور برکات حاصل ہوئی تھیں، وہ سب اس ایک شر کی وجہ سے تاریک ہو جاتی ہیں، اور ان تمام طاعات کا نور اور حلاوت اور فائدہ رخصت ہو جاتا ہے، اللہ بچائے۔ طاعت کا فائدہ یہ ہے کہ انسان ایک طاعت کے بعد دوسری طاعت کی طرف بڑھتا ہے، اور دوسری طاعت تیسری طاعت کی

طرف لیجاتی ہے، اور آدمی ترقی کرتا چلا جاتا ہے، لیکن جب طاعت کا نور نہیں ہوتا تو وہ طاعت بے حلاوت ہو جاتی ہے اور اس کے فوائد میں کمی ہو جاتی ہے۔

ہم لوگ تو طاعت کے نور اور اس کی حلاوت سے بھی واقف نہیں تو اس کے سلب ہونے کا کہاں احساس ہو گا، جس کو پہلے نور اور حلاوت حاصل ہو تو اس کو پھر اس کے سلب ہونے کے بارے میں پتہ چلے کہ وہ نور اب سلب ہو چکا ہے۔ ہمارے مزاجوں کے خراب ہونے کی وجہ سے ہمیں طاعت کے نور کا مطلب بھی معلوم نہیں، جو اللہ والے ہوتے ہیں، ان کو نور کا ادراک ہوتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز وہ کسی دعوت میں چلے گئے، اور وہاں کھانا کھالیا، یہ معلوم نہیں تھا کہ جن کے یہاں دعوت ہے ان کی آمدنی حرام کی ہے۔ بس ایک مسلمان نے دعوت دی چلے گئے، بعد میں پتہ چلا کہ ان کی آمدنی کچھ مشکوک ہے، فرمایا کرتے تھے کہ اس دعوت کا یہ اثر تھا کہ کافی عرصے تک اس کھانے کی ظلمت قلب میں محسوس ہوتی رہی، وہ اس طرح کہ دل میں کافی عرصے تک فاسد خیالات آتے رہے، اور ناجائز کاموں کی طرف طبیعت کا میلان ہوتا رہا۔ بہر حال، جن اللہ والوں کے قلوب مجلّی اور مصفی ہوتے ہیں ان کی قلوب پر ذرا سا دھبہ بھی لگ جائے تو ان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ قیامت آگئی۔

بہ دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر زباغِ دل خلالے کم بود

چونکہ ہم لوگوں کے ذوق اور مزاج خراب ہو گئے ہیں، اس لئے نہ طاعت کے نور اور لذت کا ہم کو ادراک ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے سلب ہونے کا ادراک ہوتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ جس دن کوئی شخص بدنظری کے گناہ میں مبتلا ہوگا، اس دن اس کی طاعات میں نور نہیں ہوگا، اور اس طاعت کے دنیوی فوائد اس کو حاصل نہیں ہوں گے۔ اس لئے حضرت نے آگے فرمایا کہ اس لئے اس کا علاج اہتمام سے کرنا چاہئے۔

یہ مادہ شر نہیں

پھر علاج کے بارے میں فرمایا کہ "ظاہر ہے کہ یہ مادہ خلقی ہے، پس وہ شر نہیں" یعنی یہ شہوت اور نفسانی خواہشات کا دل میں پیدا ہونا یہ بذات خود شر نہیں، کیونکہ یہ خلقی اور فطری ہے، کوئی انسان اس مادے سے خالی نہیں، بلکہ اس مادے سے انسان کا خالی ہونا عیب ہے، لہٰذا اپنی ذات میں یہ شر نہیں، بلکہ اس میں بہت سی مصالح ہیں کیونکہ اس کی بنیاد پر توالد اور تناسل قائم ہے، عالم کا نظام اس پر قائم ہے، اگر یہ مادہ نہ ہو تو عالم کا نظام فنا ہو جائے گا۔ البتہ اس مادے کے ناجائز اقتضا پر عمل کرنا شر ہے، یعنی مادہ خود شر نہیں، اور خود طبیعت میں میلان اور خواہش پیدا ہونا شر نہیں، لیکن اس کے ناجائز تقاضے پر عمل کرنا شر ہے، اور اس کے جائز تقاضے پر عمل کرنا شر نہیں، بلکہ خیر محض ہے۔

اس مادے کے جائز استعمال پر ثواب

حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص اپنے گھر میں داخل ہوا اور اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور بیوی نے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا تو اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس پر اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں۔ لہٰذا اس مادے کے جائز استعمال پر تو ثواب ملتا ہے۔ اس لئے نہ مادہ بذات خود شر ہے

اور نہ ہی اس مادّے کو صحیح جگہ پر استعمال کرنا شر ہے بلکہ خیر ہے، لیکن صرف اس مادّے کا غلط جگہ پر استعمال کرنا اور اس مادّے کے غلط تقاضے پر عمل کرنا شر ہے۔ اور وہ عمل کرنا اختیاری ہے اور اختیاری کی ضد بھی اختیاری ہے، پس فعل سے رکنا اختیاری ٹھیرا، اس میں کوئی معذوری نہیں۔ پس ہمت کیجئے، یہی اس کا جواب ہے، چندے تکلف ہوگا، پھر عادت ہو جائے گی پھر لذت اور فرحت ہو گی۔

اس بیماری کا علاج ہمت ہے

اشارہ اس طرف فرمادیا کہ اس کے علاج کے لئے کوئی ایسا نسخہ نہیں ہے کہ وہ نسخہ گھول کر پلادیا جائے اور اس کے بعد دل میں گناہ کا کوئی تقاضہ ہی پیدا نہ ہو۔ اور نہ کوئی ایسا وظیفہ ہے جو پڑھ کر پھونک دیا جائے اور پھر شہوت کا کوئی تقاضہ دل میں پیدا نہ ہو۔ ایسا نہیں ہوگا۔ پہلے بتادیا کہ یہ مادہ بذات خود شر نہیں اور اس کے جائز تقاضے پر عمل کرنا بھی شر نہیں، ہاں! اس کے غلط تقاضے کے دل میں پیدا ہونے کے بعد اس کے اوپر عمل کرنا شر ہے، اور وہ اختیاری ہے، اور جب عمل اختیاری ہے تو اس سے بچنا بھی اختیاری ہے، اور جو بھی کام اختیاری ہو اس کے لئے ہمت کی ضرورت ہے، آدمی ہمت سے کام لے اور ہمت کو استعمال کرے۔

بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں نے یہ کام چھوڑا تو جان پر بن جائیگی، اس لئے میں یہ کام نہیں چھوڑ سکتا۔ یعنی یہ کام عقلی اعتبار سے تو بیشک اختیاری ہے لیکن عملی زندگی میں آکر دیکھو تو یہ معاملہ غیر اختیاری معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کام کو چھوڑنے سے مجھ پر قیامت آجاتی ہے، پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے، لہٰذا یہ کیسے کہہ دیا جائے کہ یہ کام اختیاری ہے۔

کسی عادت کے چھوڑنے پر تکلیف ہونا اضافی ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جتنے بھی افعال اختیاری ہوتے ہیں، ان کا شدید تقاضہ ہونا اور ان کے چھوڑنے پر شدید تکلیف کا مرتب ہونا، یہ سب چیزیں اضافی ہیں، حقیقی نہیں ہیں۔ لہٰذا ایک شخص کی نسبت سے کم ہوگی اور دوسرے شخص کی نسبت سے زیادہ ہوگی، ایک شخص کو ایک کام کے چھوڑنے میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے اور دوسرے شخص کو کم تکلیف ہو رہی ہے، تیسرے کو اور کم ہو رہی ہے چوتھے کو اور کم ہو رہی ہے، لہٰذا کسی فعل کا اختیاری اور غیر اختیاری ہونا یہ حقیقی ہے، اور اس اختیاری فعل کے چھوڑنے پر تکلیف کا شدید ہونا اضافی ہے جو افراد کے اختلاف سے مختلف ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ ایک آدمی خود اس فعل کے چھوڑنے کو اپنے حق میں شدید بنالیتا ہے اور دوسرا آدمی اس فعل کو اپنے حق میں خفیف بنالیتا ہے۔ اگر ایک کام کو بار بار کر کے تم اپنے آپ کو اس کا عادی بنالو گے تو عادی بنانے کے نتیجے میں اس کا چھوڑنا بہت دشوار ہو جائے گا۔ لہٰذا فی نفسہٖ چھوڑنا دشوار نہیں تھا لیکن اپنے اختیاری عمل سے عادت ڈال ڈال کر اس کو اپنے حق میں مشکل بنادیا۔ اور جب اس کام کو چھوڑنا مشکل بنادیا تو اب یہ کہہ دیا کہ اس کا چھوڑنا غیر اختیاری ہے۔ ارے بھائی! جس طرح تم نے عادت بنا کر مشکل بنایا تھا، اسی طرح عادت ڈال کر چھوڑ بھی سکتے ہو۔

دیکھئے! پان، بیڑی، سگریٹ، تمباکو وغیرہ اگر یہ چیزیں کسی شخص کو پہلی مرتبہ کھلاؤ گے تو اس کو چکر آئیں گے، الٹی ہو جائیگی، اگر اس سے کہا جائے کہ آئندہ یہ مت کھانا وہ کہے گا کہ میں توبہ کرتا ہوں آئندہ نہیں کھاؤں گا۔ اسی دن چھوڑنے

کو تیار ہو جائے گا بلکہ کھانے کے مقابلے میں چھوڑنا زیادہ آسان ہوگا۔ لیکن دوسرے دن آپ نے اس کو وہ چیز دوبارہ کھلادی تو پہلے دن کھانے سے جو تکلیف ہوئی تھی اب دوسرے دن اس سے کم تکلیف ہوگی تیسرے دن پھر کھلادیا تو اب تکلیف اور کم ہوگی، ہوتے ہوتے اب اس کی عادت بن گئی، اب نہیں چھوٹتی۔ ع

چھوٹتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اب اتنی عادت ہوگئی کہ اب اگر اس کو چھوڑے تو قیامت گزر جائے۔ اب آپ بتائیں کہ کیا تمباکو زندگی کے لئے ایسا ناگزیر تھا کہ اس کو چھوڑنا بڑا مشکل تھا؟ ایسا نہیں تھا، بلکہ تم نے اپنے عمل سے اس کی عادت ڈال لی، اور اتنی عادت ڈالی کہ وہ تمہاری زندگی کا ایک حصہ بن گیا اور اب اس کو چھوڑنا تمہیں مشکل نظر آنے لگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فی نفسہ اس کو چھوڑنا مشکل نہیں تھا، لیکن تم نے خود اپنے اختیاری عمل سے اس کو مشکل بنادیا۔ اور جب تم نے اپنے اختیاری عمل سے اس کو مشکل بنادیا تو اب تم اپنے اختیاری عمل سے اس کو آسان بھی بناسکتے ہو، لہٰذا اس کو اسی طریقے سے اختیاری عمل کے ذریعہ چھوڑنا چاہو گے تو چھوٹ بھی جائیگا۔

عربوں کا قہوہ

عربوں کے یہاں قہوہ کا بڑا رواج ہے، جب میں چھوٹا تھا اور دارالعلوم نانک واڑہ میں قدوری، کافیہ وغیرہ پڑھتا تھا، اس زمانے میں قطر کے ایک شیخ کراچی آگئے، ان سے ملاقات کے لئے طلبہ کا ایک وفد جا رہا تھا، میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا، جب ہم وہاں پہنچے تو سب سے پہلے انہوں نے قہوہ کے ذریعہ ہماری خاطر

تواضع کی، اس سے پہلے قہوہ نہ کبھی پیا تھا اور نہ چکھا تھا، چنانچہ چھوٹے فنجانوں میں ذرا ذرا سا قہوہ سب کے سامنے لاکر رکھا گیا، ہم اپنے دل میں سوچ بیٹھے تھے کہ یہ قہوہ بڑا میٹھا اور لذیذ ہو گا، لیکن جب اس کو منہ سے لگایا تو وہ اتنا کڑوا تھا کہ اس کو حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا، مجھے یاد ہے کہ اس وقت میرے سر میں درد ہو گیا اور یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس ایک گھونٹ کو کس طرح اگلیں یا کس طرح اس کو نگلیں، میں سوچنے لگا کہ یا اللہ! یہ عرب لوگ تو یہ قہوہ ہر وقت پیتے رہتے ہیں اور ہمارے تو حلق سے بھی نہیں اتر رہا ہے۔ بہر حال، پہلی مرتبہ اس وقت قہوہ پیا، پھر رفتہ رفتہ عربوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع ہوا تو وہاں یہ قہوہ ہر وقت چلتا ہی تھا، ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے پینا شروع کیا، یہاں تک کہ اب وہ اتنا لذیذ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ساری کڑواہٹ اور تلخی جاتی رہی اور اس کے پینے میں مزہ آنے لگا۔

زیتون کی کڑواہٹ

۱۹۶۳ء میں جب ہوش کے عالم میں پہلی بار سعودی عرب گیا، جدہ میں ایک بازار میں جانا ہوا، وہاں دیکھا کہ ایک دکان میں تھال کے اندر زیتون رکھے ہوئے ہیں اور ان زیتون سے تیل بھی رِس رہا تھا۔ زیتون کا نام قرآن کریم میں پڑھا تھا، لیکن کبھی زیتون کو نہ تو دیکھا تھا، نہ کھایا تھا، نہ چکھا تھا۔ البتہ اس کی تعریف سنی تھی کہ زیتون بڑا لذیذ ہوتا ہے، اب دماغ میں یہ بات تھی کہ یہ زیتون میٹھا ہو گا اور دیکھنے میں بھی ایسا لگتا تھا کہ یہ زیتون میٹھا ہو گا، چنانچہ زیتون خریدا اور میٹھا سمجھ کر منہ میں رکھا، لیکن جیسے ہی منہ میں رکھا تو کڑوا ہونے کی وجہ

سے اس کو نگلنا مشکل ہو گیا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کو کھاتے کھاتے عادت ہو گئی، اور اب وہ اتنا لذیذ معلوم ہونے لگا کہ کوئی حد و حساب نہیں۔

بہر حال، یہ کہنا کہ فلاں عادت کو چھوڑنا منطقی اعتبار سے تو اختیاری ہے لیکن حقیقت میں وہ ہمارے اختیار سے باہر ہے، دراصل وہ ہمارے اختیار سے اس لئے باہر ہو رہی ہے کہ ہم نے خود اپنے عمل سے اس کی عادت ڈال لی، اور اب اس عادت پڑنے کے نتیجے میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کو چھوڑنا بہت مشکل ہے، لیکن جب تم ایک مرتبہ چھوڑنے کا ارادہ کر لو گے اور عزم اور ہمت کر لو گے تو وہ عادت اس طرح چھوٹ جائے گی کہ پھر یاد بھی نہیں آئے گی۔

کاموں کو چھوڑنا اختیار میں ہے

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مت سمجھو کہ اس کام کو چھوڑنا غیر اختیاری ہے بلکہ اختیاری ہے، البتہ صرف ہمت کی ضرورت ہے، ہمت کو استعمال کر کے پختہ ارادہ کر لو کہ مجھے یہ چیز چھوڑنی ہے، چاہے اس کے نتیجے میں میرے دل پر آرے چل جائیں، چاہے میرے اوپر پہاڑ ٹوٹ جائیں، لیکن میں اس کام کو چھوڑوں گا۔ اس طرح کرنے سے چند روز تکلیف ہو گی، دقت ہو گی، پھر رفتہ رفتہ عادت ختم ہو جائے گی، اس کے بعد پھر کبھی اس کام کا دل میں تقاضہ بھی ہو گا تو اس وقت بچنا دشوار نہیں ہو گا، بلکہ پھر اس کام سے بچنے میں ایسی لذت اور فرحت حاصل ہو گی کہ اس کے مقابلے میں اس کام کے کرنے کی لذت اور فرحت ہیچ ہو گی۔

خارش والے کو کھجانے کی لذت

حضرت والا نے اس کی ایک خوبصورت مثال دی ہے، جیسے ایک آدمی کے جسم پر خارش ہو رہی ہو تو اس کو کھجانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ چنانچہ یہ مقولہ مشہور ہے کہ دنیا میں دو کاموں میں مزہ ہے، ایک کھاج میں ایک راج میں۔ یعنی ایک کھجانے میں اور دوسرا حکومت کرنے میں بڑا مزہ ہے۔ بہر حال، کھجلانے میں بڑا مزہ آتا ہے، لیکن اس کھجلانے کا انجام یہ ہے کہ جتنا کھجائے گا اتنا ہی وہ زخمی ہو گا، اور خارش اور زیادہ بڑھے گی، اتنی ہی بیماری بڑھے گی۔ اب ڈاکٹر اس سے یہ کہہ رہا ہے کہ اپنے جسم کو مت کھجاؤ، اس سے تمہاری بیماری اور زیادہ ہو گی، وہ کہتا ہے کہ روکنا یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ دیکھو، تمہاری صحت اس پر موقوف ہے کہ کھجال مت کرو، اب وہ بیمار ڈاکٹر کے کہنے پر کھجال کو روکتا ہے، لیکن روکنے میں اس کو بڑی تکلیف، مشقت اور دقت ہو رہی ہے، کھجلی اٹھ رہی ہے، طبیعت کھجلی کرنے کو چاہ رہی ہے مگر اس نے زبردستی اپنے آپ کو روک لیا۔ اب شروع میں اس کو بڑی تکلیف ہوئی لیکن جب وہ مسلسل رکتا رہا تو رفتہ رفتہ اسکو عادت ہو گئی، اب خارش سے رکنے میں دقت اور پریشانی نہیں ہو رہی ہے، یہاں تک کہ جب نہ کھجانے کے نتیجے میں بیماری دور ہو گئی اور خارش ہی ختم ہو گئی تو اب صحت حاصل ہو گئی۔ اور صحت کی یہ لذت اس خارش کرنے کی لذت کے سامنے ہیچ ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ کھجانے میں جو لذت آرہی تھی وہ جھوٹی لذت اور جھوٹا مزہ تھا، اب صحت کی جو لذت اور فرحت حاصل ہو رہی ہے، یہ حقیقی لذت اور مزہ ہے۔

بد نگاہی کی لذت چھوڑ دو

اسی طرح بد نگاہی کے نتیجے میں جو لذت حاصل ہو رہی ہے، وہ خارش والی لذت ہے، اس کو چھوڑنے سے تکلیف ضرور ہو گی، لیکن ایک مرتبہ تکلیف اٹھانے کے بعد جب انسان چھوڑنے کا عادی ہو جائے گا، اور اس کی نگاہ پاکیزہ ہو جائے گی، اور اس کو عفت اور عصمت حاصل ہو جائے گی، اور تقویٰ کی لذت حاصل ہو گی تو اس کے آگے گناہوں کی لذتیں ہیچ ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ گناہ سے بچنے میں ایک طرف صحت کی لذت ہے۔ اور دوسری طرف گناہ سے بچنے میں اس تصور کی لذت ہے کہ میں نے اپنی ایک بڑی خواہش کو اپنے محبوب حقیقی کے لئے قربان کر دیا ہے، جب کسی سے حقیقی محبت ہوتی ہے تو اس کے آگے اپنی خواہشات کو کچلنے میں بڑی لذت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ اس وقت یہ تصور کرتا ہے کہ ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ایک اور جگہ پر حضرت والا فرماتے ہیں کہ ایسے موقع پر انسان دو کام کرے: ایک یہ کہ اپنی ہمت کو استعمال کر کے چل کھڑا ہو، دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اس ہمت کے اندر قوت عطا ہونے کی دعا کرے کہ یا اللہ! میری ہمت کمزور ہے، میں اپنی طرف سے یہ ارادہ کرتا ہوں کہ اب یہ نگاہ غلط جگہ نہیں اٹھے گی، لیکن یا اللہ! میں کیا اور میرا ارادہ کیا، میری ہمت کیا اور میرا عزم کیا، اے اللہ!

ہمت بھی آپ کے قبضہ قدرت میں ہے اور ارادے بھی آپ کے قبضہ قدرت میں ہیں، اے اللہ! اپنی رحمت سے میری ہمت میں قوت عطا فرمادیجئے، اور اس عزم پر مجھے ثبات عطا فرمادیجئے۔ اے اللہ! مجھ سے اس شر کو دور فرمادیجئے۔ اور یہ دعا کرے کہ:

اِنْ لاَ تَصْرِفْ عَنِّی کَیْدَھُنَّ اَصْبُ اِلَیْھِنَّ وَاَکُنْ مِنَ الْجَاھِلِین

(سورۂ یوسف)

جب انسان یہ دعا کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ہمت اور قوت عطا فرمادیتے ہیں اور انسان کو اس گناہ سے نجات مل جاتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ:

"مَنِ اسْتَعَفَّ یُعِفُّہُ اللہ"

جو عفت حاصل کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کو عفیف بنا ہی دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو گناہوں سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ہمت میں قوت پیدا کرنے کا طریقہ

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ:

"حضور کی تنبیہ سے معلوم ہوا کہ بدنظری فعل اختیاری ہے اور علاج "استعمالِ اختیار" ہے، مگر باوجود اس کے پھر بھی اختیار کے استعمال کی ہمت نہیں ہوتی اور گناہ ہو جاتا ہے، ہمت میں قوت نہیں"

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۴)

یہ وہی بات ہے جس میں کسی نہ کسی گناہ کے سلسلے میں آج ننانوے فیصد

افراد مبتلا ہیں، معلوم ہے کہ یہ چیز اختیار میں ہے، اس کے باوجود اس کو چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوتی، اور ہمت میں قوت نہیں۔ جیسا کہ غالب شاعر کہتا ہے کہ:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مطلب یہ ہے کہ علمی اور عقلی طور سے معلوم ہے کہ یہ راستہ اچھا ہے اور یہ راستہ برا ہے، اعتقاد بھی ہے، لیکن طبیعت اس طرف راغب نہیں ہوتی، اس کا کیا علاج؟

ہمت کے استعمال سے قوت کا پیدا ہونا

جواب میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ:

"قوت بھی استعمال ہی سے پیدا ہوگی"

یہ نہیں ہے کہ پہلے سے فرض کرلیا کہ ہمت کمزور ہے، لہٰذا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے، بلکہ ہمت کو استعمال کرو، اور اس کو جتنا استعمال کروگے اس میں اتنی ہی قوت آئے گی۔

دنیا کی اکثر چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو جتنا استعمال کروگے تو استعمال کے نتیجے میں آہستہ آہستہ کمزور پڑتی جاتی ہیں، مثلاً گاڑی ہے، اس کو جتنا استعمال کروگے وہ کمزور ہوتی چلی جائے گی، آخر میں باکر ٹھپ ہو جائے گی، مکان کو استعمال کروگے تو آہستہ آہستہ بوسیدہ ہوتا چلا جائے گا، کپڑا استعمال کرنے کے نتیجے میں پرانا ہوتا جائے گا۔ لیکن بعض چیزیں اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہیں کہ ان کو جتنا استعمال کروگے ان میں اور زیادہ طاقت آئے گی، جیسے حافظہ، اس حافظہ کو جتنا

استعمال کیا جائے گا، اتنی ہی قوت آئے گی، کوئی یہ نہ سوچے کہ اگر میں نے قرآن حفظ کر لیا تو پھر دوسری چیزیں یاد کرنے کی گنجائش نہیں رہے گی، ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر اور قوت پیدا ہوگی۔ اسی طرح "ہمت" بھی ایسی چیز ہے کہ اس کو انسان جتنا استعمال کریگا اتنی قوت پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ اس میں مزید طاقت پیدا فرمادیں گے۔

حسن پسندی کا علاج

ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ:

مجھ میں اس قدر حسن پسندی ہے کہ معمولی اشیاء کو بھی نہایت قرینہ اور خوش ترتیبی سے رکھتا ہوں اور حسن صورت کی طرف بھی بے حد کشش ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۵)

حضرت والا کا اس کا جواب عربی میں لکھا اس سے پتہ چلا کہ وہ صاحب عالم ہونگے، چنانچہ لکھا کہ:

بعضه خيرٌ فاشكروا عليها، وبعضه شرّ فاصبروا عنها، أي غض البصر حيث أمرالشارع بالغض، ولو بتكلف شديد يحتمل زهوق الروح، فإن الله غيور يشتد غيرته عن النظر الى ما نهى الله أن ينظر إليه فالحذر الحذر أن يغيظ المحبوب الأكبر (ایضاً)

یعنی جو حالت آپ نے لکھی ہے اس کا کچھ حصہ تو خیر ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اچھی چیز کی طرف رغبت عطا فرمائی ہے اور اس کا حق ادا کرنے کی

توفیق ہوتی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور کچھ حصہ شر ہے، وہ ہے حسن صورت کی طرف میلان، جس کا دیکھنا جائز نہیں، تو اس پر صبر کرو اور اپنی نگاہ کو نیچی رکھو اگرچہ اس میں اتنی تکلیف ہو کہ جان نکلتی محسوس ہوتی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی بڑے غیرت مند ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو اس بات سے بڑی غیرت آتی ہے کہ بندہ ایسی چیز کو دیکھے جس کے دیکھنے کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔ جب تمہارے اندر حسن پسندی ہے اور حسن اچھا لگتا ہے اور حسن سے محبت ہے تو پھر حسن کا جو کمال ہے وہ تو اللہ جل شانہ کے پاس ہے اور وہی محبوب اکبر ہیں، پھر ان دنیا کے معمولی حسن کی خاطر اس محبوب اکبر کو ناراض کرنا کیسی غیرت کی بات ہے؟ اس سے بچو۔

وسوسۂ حرام کاری اور اس کا علاج

ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ:

"شیطان یہ سمجھاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر ان مرغوب صورتوں پر جائز شرعی قبضہ دیدے تو اس وقت کیا کرو گے؟ سو جائز قبضہ سمجھ کر حظ کا خیال کرو اور حظ حاصل کرو، حرام کاری کا خیال مت کرو"

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۵)

حضرت والا نے جواب دیا کہ:

خیال کا علاج بھی خیال ہے (یعنی اس خراب خیال کا علاج بھی ایک دوسرا خیال ہے وہ یہ کہ) اس وقت یہ خیال کرو کہ اگر اس عورت کے شوہر کو اس خیال کی اطلاع کردوں تو کتنی رُسوائی ہو (اس کو یہ اطلاع

کردوں کہ میں جو خیال کررہا ہوں یہ کوئی ناجائز خیال نہیں کررہا ہوں، بلکہ یہ خیال کررہا ہوں کہ تو مر جائے اور تیری بیوی کے ساتھ میرا جائز تعلق قائم ہو جائے، تو اس وقت کتنی رسوائی ہو گی) تو اللہ تعالیٰ تو بے کہے ہی اس خیال پر مطلع ہیں۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ وہ اس ارادے کو دیکھ رہے ہیں۔ نیز اس سلسلے میں عقوبت جہنم کو مستحضر کرکے اس میں لگ جائے، یا نفس سے یہ کہے کہ جس طرح تو مجھے دوسری عورتوں سے حظ حاصل کرنے کو کہتا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص میری بیوی سے حظ حاصل کرے اور مجھ کو اس کا علم ہو جائے تو میں کیا کرونگا؟ ظاہر ہے کہ مرنے مارنے پر تیار ہو جاؤنگا۔ اسی طرح کیا دوسروں کو غیرت نہ ہو گی کہ اگر ان کو خبر ہو جائے تو وہ بھی مجھے مار ڈالیں اور ہر طرح کے ضرر پہنچانے پر آمادہ ہو جائیں، پھر جہنم کا نقشہ پیش نظر کرلے۔ علاوہ اس کے شیطان کی وہ تاویل ایسی ہے کہ کوئی شخص سچ مچ کسی عورت سے زنا کرنے لگے اور یہ سوچ لے کہ اگر اس پر جائز قدرت ہو تو اس طرح مقاربت کروں، اور اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں، یہی حکم ہے زنا بالقلب کا"۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۵)

حضرت والا نے جواب میں یہ جو فرمایا کہ آدمی یہ سوچے کہ میری بیوی، میری بہن اور میری بیٹی کے بارے میں اگر دوسرا شخص اس طرح کی بات سوچے تو مجھے غیرت آئے گی یا نہیں؟ اور میں مرنے مارنے کے لئے تیار ہو جاؤں گا یا

نہیں؟

حضورؐ سے زنا کی اجازت طلب کرنے والا

یہ بات حدیث سے ماخوذ ہے، "مجمع الزوائد" میں یہ حدیث ہے کہ ایک صاحب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آکر عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں آپ کے ہر حکم پر عمل کرنے کو تیار ہوں، لیکن ایک اجازت مانگتا ہوں، وہ یہ کہ مجھے زنا سے صبر نہیں ہوتا، آپ مجھے زنا کی اجازت دیدیں۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ وہ شخص کس چیز کی اجازت طلب کر رہا ہے اور کس سے طلب کر رہا ہے؟ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قریب بلایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا کہ یہ بتاؤ! یہ زنا تم جس عورت کے ساتھ کرنا چاہتے ہو، وہ عورت کسی کی ماں ہوگی، کسی کی بہن ہوگی، کسی کی بیٹی ہوگی، کسی کی خالہ ہوگی، اگر دوسرا کوئی شخص یہی عمل تمہاری بہن کے ساتھ کرنا چاہے تو کیا تم پسند کروگے؟ اس نے جواب دیا: نہیں یارسول اللہ! کوئی تمہاری بیٹی کے ساتھ یہ عمل کرنا چاہے تو تم پسند کروگے؟ اس نے جواب دیا: نہیں یارسول اللہ! کوئی تمہاری بیوی کے ساتھ یہ عمل کرنا چاہے تو تم پسند کروگے؟ یا تمہاری خالہ کے ساتھ یہ عمل کرنا چاہے تو کیا تم پسند کروگے؟ اس نے کہا کہ نہیں یارسول اللہ! پھر فرمایا کہ جب دوسروں کے اس عمل کو تم گوارا نہیں کرسکتے اور اس عمل کے نتیجے میں تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو پھر وہی کام تم دوسروں کی خواتین کے ساتھ کرنا چاہتے ہو، کیا ان کو تکلیف نہیں ہوگی؟ کیا وہ لوگ اس کو گوارہ کرلیں گے؟ وہ صاحب کہتے ہیں کہ جب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا

تھا، اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ مسلمان ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ میرے لئے زنا کو چھوڑنا ہے، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنکر میرے دل میں اس عمل کی ایسی نفرت ہوگئی کہ پھر اس عمل کی طرف رجحان نہیں ہوا۔

زنانہ اشیاء کی فروخت

ایک صاحب نے یہ پوچھا کہ بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں مردوں کو عورتوں سے واسطہ پڑتا ہے، مثلاً زنانہ اشیاء کی خرید وفروخت کرنے والے دکاندار، زیورات کے تاجر، ہسپتال کے ڈاکٹر اور ملازم وغیرہ، ایسے مواقع پر بدنگاہی سے بچنے کے طریقے پر روشنی ڈالیں تو بڑی عنایت ہوگی۔

یہ حضرات واقعۃً سب سے زیادہ مشکل میں گھرے رہتے ہیں، کیونکہ ہر وقت خواتین سے سابقہ رہتا ہے جس کی وجہ سے بچنا آسان نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو کوئی ایسا حکم نہیں دیا جس پر عمل کرنا ناممکن ہو۔

پہلی بات تو یہ سمجھ لیں کہ عورت کو دیکھنا اور اسکے چہرے پر نظر ڈالنا، بذات خود گناہ نہیں، بلکہ یہ اس وقت گناہ ہوتا ہے جب لذت لینے کی نیت سے نظر ڈالے یا اس وقت عملاً التذاذ ہورہا ہو، اس وقت نظر ڈالنا حرام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی عمل کے دوران کسی عورت سے بات چیت کرنے کی ضرورت پیش آگئی اور اس بات چیت کے دوران نہ لذت لینے کا قصد ہے اور نہ عملاً التذاذ ہوا، تو اس حد تک عورت کو دیکھنا حرام نہیں، لیکن چونکہ اس کا معلوم کرنا مشکل ہے کہ کہاں لذت کا قصد ہے اور کہاں لذت کا قصد نہیں، یا کہاں عملاً

التذاذ ہو رہا ہے اور کہاں نہیں ہو رہا ہے، اس لئے یہ کہہ دیا گیا کہ عورت کو دیکھو ہی مت، اسی وجہ سے قرآن کریم نے بھی غضِ بصر کا حکم دیا، اس لئے کہ تم کہاں کہاں یہ امتیاز کرتے رہو گے کہ التذاذ ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا ہے، اور کہاں قصدِ لذت ہے اور کہاں نہیں ہے۔ لہٰذا آسان راستہ یہی ہے کہ نظر ہی مت ڈالو۔

نظر اٹھا کر مت دیکھو

اب جن مردوں کو بکثرت خواتین سے سابقہ پڑتا ہے، ان کے لئے سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ غضِ بصر سے کام لیں۔ اس لئے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ خواتین سے معاملہ کرتے وقت ان کی طرف نظر بھی اٹھائے، بہت سے لوگوں کو میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر کام کرتے ہیں مگر ان کی نگاہ نہیں اٹھتی، بلکہ نگاہ نیچی رہتی ہے اور کام کرتے رہتے ہیں۔ اور اگر بالفرض کہیں نظر اٹھانے کی ضرورت پیش آہی جائے تو اس نظر کو التذاذ سے محفوظ رکھے، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ! میری حفاظت فرمایئے۔ اور اگر نظر پڑتے وقت کچھ قصدِ لذت ہو جائے تو فوراً استغفار کرے اور توبہ کرے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب کا مجاہدہ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے اور مطب چلاتے تھے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بتا کر یہ مطب شروع کیا تھا، پہلے وکالت کرتے تھے، جب مطب شروع کیا تو وہاں مرد بھی آنے لگے اور عورتیں بھی آنے لگیں۔ حضرت فرماتے تھے کہ ابتداء میں بعض اوقات علاج

کے لئے میں گھر پر بھی چلا جاتا تھا، ایک مرتبہ مجھے ایک گھر میں علاج کے لئے بلایا گیا۔ وہاں ایک خاتون بیمار تھیں، جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اس خاتون کا لباس بھی پوری طرح ساتر نہیں تھا، میں بڑا پریشان ہوا کہ یا اللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا، پتہ نہیں کیا ہوگا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی۔

بعد میں میں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ حضرت: میں پہلے وکالت کرتا تھا، اس میں دوسرے قسم کا فتنہ تھا، اور اس ڈاکٹری میں اور قسم کا فتنہ ہے، خواتین سے ہر وقت واسطہ پڑتا ہے، میں کیا کروں؟ جواب میں حضرت والا نے دو جملے لکھے، لکھا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے اپنی نگاہ اور دل کی حفاظت کیجئے، میں بھی دعا کرتا ہوں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب یہ خط آیا تو میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور پھر مطب میں بیٹھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، میرا دل اس معاملہ میں پتھر ہو گیا۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں نے نگاہ کی حفاظت اس طرح کی کہ میں نے سوچا کہ یہ غض بصر کرنا اور جب عورت سامنے آجائے تو نگاہ نیچی کرنا یہ بڑا مشکل کام ہے، اس لئے میں نے سوچا کہ اس کی عادت کیوں نہ ڈال لی جائے کہ سامنے چاہے مرد ہو یا عورت، نگاہ نیچی ہی کر کے بات کی جائے۔ چنانچہ میں نے اس کی مہینوں مشق کی کہ سامنے مرد ہو یا عورت، نگاہ اٹھا کر دیکھا ہی نہیں، جب بھی کسی سے بات کی، نگاہ نیچی کر کے بات کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مجھے پتہ ہی نہیں چلتا کہ سامنے مرد ہے یا عورت، بوڑھا ہے یا جوان ہے۔ ہمارا تو ایک ہی طریقہ ہے کہ نگاہ نیچی رہے۔

اللہ کی مدد ہمت پر آتی ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جب آدمی ان چیزوں میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کو بچنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ انسان کو ایسے حالات میں مبتلا فرماتے ہیں تو پھر آسانی بھی پیدا فرماتے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ بندے کو بے یارومددگار چھوڑ دیں۔ اگر انسان بچنے کا قصد اور ارادہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے مدد چاہے اور اپنی طرف سے تھوڑی بہت ہمت کا استعمال کرے تو میرا تو اس پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو بے یارومددگار نہیں چھوڑیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ لیکن اگر انسان بچنے کا قصد ہی نہ کرے، ارادہ ہی نہ کرے، فکر ہی نہ کرے، بلکہ غفلت میں پڑا رہے، یہ بہانہ بنائے رکھے کہ میں تو ایسی جگہ میں مبتلا ہوں کہ بچ ہی نہیں سکتا، ہر وقت عورتوں سے واسطہ ہے، عورتیں ہر وقت سامنے آتی ہیں، میں کیا کروں؟ یہ سب بے فکری کے بہانے ہیں۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا کوئی وعدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد فرمائے اور اس گناہ سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

چھٹی مجلس
غیبت اور اس کا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

چھٹی مجلس

غیبت اور اس کا علاج

الحمد لله رب العالمین والعاقبة للمتقین، والصلاة والسلام علیٰ رسوله الکریم، وعلیٰ آله واصحابه اجمعین اما بعد!

ابتک "بدنظری" سے متعلق بیان چل رہا تھا اور اس سے بچنے کی تدبیریں بتائی گئی تھیں، آگے ایک اور باطنی بیماری کا تذکرہ ہے، وہ ہے "غیبت" یہ بیماری ایسی ہے کہ شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ اللہ کی توفیق سے بچا ہوا ہو، ورنہ سب لوگ کسی نہ کسی درجے میں اس بیماری میں مبتلا ہیں، اور یہ بیماری اتنی سنگین ہے کہ قرآن کریم نے اس کے لئے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ کسی اور بیماری کے لئے ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے، چنانچہ فرمایا:

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ (سورہ حجرات پارہ ۲۶)

(یعنی تجسس نہ کرو اور تم میں سے بعض لوگ دوسرے بعض کی غیبت نہ کریں، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے، پس تم اس کو ناپسند کرتے ہو) اس آیت میں غیبت کو مردار بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا۔ ایک تو انسان کا گوشت، اور انسان بھی بھائی، اور بھائی بھی

مردہ، کوئی بھی انسان جس کے اندر انسانیت کا ذرہ بھی موجود ہوگا، وہ اس کام کا نہ تو ارتکاب کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچ سکتا ہے، لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ غیبت کرنا بھی ایسا ہے جیسے مردار بھائی کا گوشت کھانا۔ اور یہ "غیبت" گناہ کبیرہ ہے، معمولی گناہ نہیں ہے۔

غیبت کے گناہ کی شدّت

یہ غیبت کرنا ایسا ہی گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے، جیسے خنزیر کھانا گناہ ہے، جیسے چوری کرنا اور ڈاکہ ڈالنا گناہ ہے۔ بلکہ غیبت کرنا ان گناہوں سے زیادہ سنگین ہے، کیونکہ شراب پینے اور خنزیر کھانے کا تعلق خالصتاً حقوق اللہ سے ہے، اگر کوئی شخص شراب نوشی کرتا ہے، یا خنزیر کھاتا ہے تو وہ اپنی ذات کا گناہ کرتا ہے، اس کا حقوق العباد سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اگر کبھی اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطا فرمادیں گے تو شراب کا گناہ بھی معاف ہو جائے گا اور خنزیر کھانے کا گناہ بھی معاف ہو جائے گا۔ لیکن غیبت کا گناہ ایسا ہے کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور حقوق العباد کا اصول یہ ہے کہ یہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک صاحب حق معاف نہ کر دے، ہزار توبہ استغفار کرتے رہو، نماز روزے کرتے رہو، لیکن یہ معاف نہیں ہونگے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنا حق تو معاف کر دوں گا، لیکن اگر تم نے کسی بندے کی جان کو نقصان پہنچایا، یا مال کو نقصان پہنچایا، یا اس کی آبرو کو نقصان پہنچایا، یا تم نے اس کی کوئی بھی حق تلفی کی، تو جب تک وہ معاف نہیں کریگا یا جب تک اس کا حق ادا نہیں کر دو گے، میں معاف نہیں کروں گا۔ حقوق العباد کا معاملہ اتنا خطرناک ہے، لیکن ہم نے اس کو اتنا معمولی سمجھ

رکھا ہے جیسے ناک پر مکھی آ بیٹھی اور اس کو اڑا دیا۔ اور ''غیبت'' بھی حقوق العباد میں سے ہے۔

غیبت کی تعریف

''غیبت'' کسے کہتے ہیں؟ غیبت یہ ہے کہ کسی مسلمان کا تذکرہ اس کی پیٹھ پیچھے اور اس کی غیر موجودگی میں اس انداز سے کیا جائے کہ اگر اس کو پتہ چلے کہ میرا تذکرہ اس انداز سے کیا گیا ہے تو اس کو ناگوار گزرے، تو یہ غیبت ہے اور گناہ ہے۔ اب ہم اپنا جائزہ لیکر دیکھیں کہ ہم لوگ صبح سے لیکر شام تک آپس میں جو گفتگو کرتے ہیں، اس میں غیبت ہوتی ہے یا نہیں؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں اس کے بارے میں یہ بات جو کہہ رہا ہوں، میں اس کے منہ پر کہہ دوں، اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غیبت تو اس وقت ہوگی جب منہ پر نہ کہہ سکیں، میں تو اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہوں۔ ارے بھائی! تم اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہو یا نہ ہو، اگر وہ بات اس کی ناگواری کا سبب ہے تو بس غیبت کی تعریف اس پر صادق آگئی اور وہ گناہ ہو گیا، اور تم نے مردار بھائی کا گوشت کھالیا۔ العیاذ باللہ۔

غیبت اور بہتان میں فرق

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میں جس شخص کی غیبت کر رہا ہوں، اس میں وہ بات واقعی موجود ہو، جو میں کہہ رہا ہوں، کیا پھر بھی گناہ ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات تم اس کے بارے میں کہہ رہے ہو، وہ بات اس کے

اندر موجود ہے اور تم اس کی سچی برائی بیان کر رہے ہو تو یہ غیبت ہے، اور اگر تم جھوٹی بات بیان کر رہے ہو، اور وہ بات اس کے اندر موجود نہیں ہے، تو پھر غیبت کے ساتھ "بہتان" لگانے کا گناہ بھی ہوگا۔

ایک شخص کے اندر ایک برائی موجود ہے، تم نے ایک مجلس کے اندر اس کی وہ خرابی بیان کر دی، مثلاً تم نے یہ کہہ دیا کہ فلاں آدمی تو بڑا جھوٹا ہے، اور حقیقت میں بھی وہ جھوٹا ہے، تو تمہارا اس کے پیٹھ پیچھے اس کے جھوٹا ہونے کا تذکرہ کرنا غیبت ہے اور گناہ ہے، بشرطیکہ اس کو اپنا جھوٹا کہلوانا ناگوار ہو۔ اور اگر وہ جھوٹا نہیں ہے، پھر بھی تم نے اس کو جھوٹا کہہ دیا، تو اس صورت میں تم نے دو گناہ کئے: ایک غیبت کرنے کا گناہ کیا اور ایک بہتان لگانے کا گناہ کیا۔ لہٰذا غیبت بڑا سنگین گناہ ہے، آدمی اپنی زبان کو سنبھال کر رکھے، اور اللہ تعالیٰ سے حفاظت کی توفیق مانگتا رہے تب تو اس گناہ سے بچ سکتا ہے، ورنہ اس گناہ کے اندر مبتلا ہو جائے گا۔

ایک پروفیسر صاحب کا غیبت پر تبصرہ

میں نے ایک مرتبہ غیبت کے بارے میں ایک مضمون لکھا، ایک یونیورسٹی کے پروفیسر صاحب نے وہ مضمون پڑھ کر مجھے ایک خط لکھا کہ آپ نے اس مضمون میں غیبت کی بہت برائی بیان کی کہ یہ غیبت گناہ کبیرہ ہے، حرام اور ناجائز ہے، اس کو چھوڑنا چاہئے۔ میں نے اس غیبت پر بہت غور کیا، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر "غیبت" کو زندگی سے نکال دیں تو یہ زندگی پھیکی ہے، اس میں پھر کوئی مزہ ہی نہیں ہے، اس لئے کہ جب ہم دو چار آدمی ملکر بیٹھتے ہیں اور کوئی بات چیت چلتی ہے تو اس بات چیت میں غیبت شامل نہ ہو تو ہم پھر کسی موضوع پر بات

چیت کریں؟ بس پھر تو "اللہ اللہ" ہی کریں، اور کوئی ہنسی مذاق کی بات، کوئی تفریح کی بات، کوئی دل لگی کی گفتگو تو ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ نے اتنا لمبا چوڑا مضمون لکھا اور اس کی اتنی برائیاں بیان کی، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ سب لوگ اپنی تفریح وغیرہ سے دست بردار ہو جائیں اور زندگی کا لطف ہی ختم کر دیں۔ چونکہ وہ پروفیسر صاحب تھے، اس لئے اپنی ذھنی سوچ کے مطابق آخر میں یہ کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ اسلام ایسی چیز کو منع کریگا جس کو انسان ہر وقت کرتا ہی ہے، اور اگر نہ کرے تو مزہ ہی نہ رہے۔ یہ خط لکھ کر بھیجا۔

میں نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ یہ جو آپ فرما رہے ہیں کہ اگر "غیبت" کو زندگی سے نکال دیا جائے تو زندگی کا مزہ ہی ختم ہو جائے، تو آپ کی زندگی کا مزہ تو "غیبت" نہ کرنے کی وجہ سے ختم ہو جائے گا، لیکن جب دوسرا شخص آپ کی غیبت کر رہا ہو، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جب آپ کو پتہ چلے کہ پروفیسر صاحب کے بارے میں فلاں شخص نے فلاں مجلس میں یہ بات کہی، فلاں شخص نے فلاں مجلس میں یہ بات کہی تو اس وقت آپ کو زندگی کا لطف آئے گا یا کیا حال ہو گا؟

اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک معیار رکھو

بات دراصل یہ ہے کہ ہر انسان اپنے لطف اور مزہ کو تو دیکھتا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھتا کہ جو کام میں دوسرے کے ساتھ کر رہا ہوں، اگر دوسرا میرے ساتھ کرے تو مجھ پر کیا گزرے؟ مجھ پر کیا بیتے؟ حدیث شریف میں جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ سلم نے ایک ایسا کیمیا کا نسخہ بیان فرمادیا کہ ایک پیغمبر ہی ایسا نسخہ بیان کر سکتا ہے، کسی اور کے بس کا کام نہیں۔ اگر اس نسخے پر عمل کرلیا جائے تو معاشرے کے سارے مسائل حل ہو جائیں اور معاشرے کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں، ساری خرابی اس نسخے کو فراموش کرنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے، وہ نسخہ یہ ہے کہ:

أحب لاخيك ماتحب لنفسك

واكره لغيرك ما يكره لنفسك

(مسند احمد ج ۴ ص ۷۰)

یعنی اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو، اور دوسروں کے لئے وہی بات ناگوار سمجھو جس کو تم اپنے لئے ناگوار سمجھتے ہو۔ یہ جو ہم نے دوہرے پیمانے بنا رکھے ہیں کہ اپنے لئے پیمانہ کچھ اور ہے اور دوسرے کے لئے کچھ اور ہے، اپنے لئے ترازو اور ہے اور دوسرے کے لئے اور ہے، اس کی وجہ سے معاشرے میں ساری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ لہٰذا ہر معاملے میں یہ دیکھو کہ میں جو معاملہ دوسرے کے ساتھ کر رہا ہوں، اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا اور وہ میری جگہ پر ہوتا تو میرے اوپر کیا گزرتی۔ ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچ لے تو کبھی بھی اس سے دوسرے کی حق تلفی نہ ہو اور ناانصافی نہ ہو اور دوسرے کا حق پامال نہ ہو۔

لہٰذا غیبت کرتے وقت ذرا یہ سوچو کہ اگر اس کی جگہ میں ہوتا، مجلس کے اندر میرا اس انداز سے ذکر ہو رہا ہوتا، اور میرے بارے میں یہ باتیں کہی جا رہی

ہوتیں جو میں دوسروں کے بارے میں کہہ رہا ہوں، تو مجھے یہ چیز پسند ہوتی یا نہیں؟ اگر پسند نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ "غیبت" ہے اور اس سے بچنا ہے۔

لوگ یہ کہتے ہیں کہ غیبت سے بچا نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ غیبت اختیار سے ہوتی ہے، غیر اختیاری نہیں ہوتی، اور جب غیبت کرنا اختیار میں ہے تو بچنا بھی اختیار میں ہے، لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے۔

غیبت کی اجازت کے مواقع

البتہ جس موقع پر کسی مسلمان کو نقصان سے بچانا منظور ہو تو اس وقت غیبت جائز ہو جاتی ہے، مثلاً ایک شخص آپ کے پاس آیا، اس نے کہا کہ فلاں شخص نے میری بیٹی کے لئے رشتہ بھیجا ہے، آپ کی نظر میں یہ آدمی کیسا ہے؟ اب اگر آپ کی نظر میں اس شخص کی ایسی برائی ہے جو شادی بیاہ کے معاملے میں قابل غور ہوا کرتی ہے، تو اس صورت میں اگر آپ وہ برائی اس کو بتادیں تاکہ وہ اور اس کی بیٹی نقصان سے بچ جائے تو یہ غیبت میں داخل نہیں۔ یا مثلاً ایک شخص دھوکہ باز ہے اور دھوکہ دے کر لوگوں سے پیسے حاصل کر لیتا ہے، اگر آپ کسی کو یہ بتادیں کہ اس شخص سے ذرا سوچ سمجھ کر معاملہ کرنا، یہ آدمی معاملے کا ٹھیک نہیں ہے، تو یہ غیبت نہیں، اس لئے کہ دوسرے شخص کو نقصان سے بچانا منظور ہے۔

لہٰذا جہاں دوسرے کو تنبیہ کرنے کی ضرورت ہو، اور دوسرے کو دنیا یا آخرت کے نقصان سے بچانے کی ضرورت ہو، وہاں کسی کی واقعی برائی بیان کرنا

غیبت میں داخل نہیں، یہ جائز ہے۔

فاسق اور گناہ گار کی غیبت کرنا

عام طور پر لوگوں میں مشہور ہے کہ جو فاسق و فاجر ہو، اس کی غیبت جائز ہے۔ مطلقاً اس طرح سے یہ بات درست نہیں، بلکہ جس طرح نیک آدمی کی غیبت جائز نہیں اسی طرح سے فاسق و فاجر کی غیبت بھی جائز نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی گناہ کو اس طرح علانیہ کرتا ہے کہ اس گناہ کی اپنی طرف نسبت سے نہیں شرماتا، اور نہ اس کو وہ برا سمجھتا ہے کہ یہ گناہ اس کی طرف منسوب ہو، تو اگر اس گناہ کا ذکر اس کی غیر موجودگی میں کر کے اس کی طرف منسوب کریں تو یہ جائز ہے۔ مثلاً ایک آدمی علانیہ شراب پیتا ہے اور سب کو بتا کر پیتا ہے، اب اگر آپ اس کے پیٹھ پیچھے یہ ذکر کریں کہ فلاں شخص شراب پیتا ہے، ظاہر ہے کہ آپ کے اس ذکر کرنے سے اس کو کوئی تکلیف اس لئے نہیں ہوگی کہ وہ خود دوسروں کو بتاتا ہے کہ میں شراب پیتا ہوں، لہٰذا یہ غیبت ناجائز نہیں ہے۔ لیکن جس گناہ کو وہ چھپانا چاہتا ہے، اور اس گناہ کا اپنی طرف منسوب ہونے کو برا سمجھتا ہے، اور اس کے ذکر سے اُس کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے پیٹھ پیچھے اس گناہ کا تذکرہ کرنا ناجائز ہے، چاہے وہ سچی بات ہو، وہ غیبت ہے، اور حرام ہے۔ لہٰذا اگر زبان پر لگام نہ ڈالی جائے تو یہ انسان کو گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اور غیبت جس طرح کرنا جائز نہیں، اسی طرح سننا بھی جائز نہیں۔

دوسروں کا تذکرہ ہی نہ کرو

اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ احتیاط اس میں ہے

کہ دوسروں کا تذکرہ ہی مت کرو، نہ اچھائی سے اور نہ برائی سے، کیونکہ جب دوسرے کا ذکر اچھائی سے بھی کروگے تو شیطان آخر میں برائی کے تذکرے میں مبتلا کرہی دیگا کہ بھائی! فلاں آدمی تو بڑا اچھا ہے لیکن اس میں ذرا یہ برائی بھی ہے۔اس لئے بہتر یہ ہے کہ انسان دوسرے کا ذکر ہی نہ کرے۔

اپنی فکر کرو

پھر دوسرے کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، بس اپنی فکر کرو۔ بقول کسی کے:

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جس کو اپنے عیوب کی فکر ہو وہ دوسروں کے عیوب کہاں تلاش کریگا جو خود بیمار ہو اور اس کے پیٹ میں درد ہو رہا ہو، وہ دوسروں کی بیماریوں کی کہاں فکر کریگا۔ جب انسان اپنی فکر میں پڑ جاتا ہے کہ میں کس عیب کے اندر مبتلا ہوں؟ میرے اندر کیا خرابی ہے؟ اس کی کس طرح اصلاح کروں اور کس طرح اس کا تدارک کروں تو پھر اس سے دوسرے کی غیبت نہیں ہوتی بہادر شاہ ظفر نے بڑے اچھے اشعار کہے:۔

تھے جو اپنی برائی سے بے خبر، رہے ڈھونڈتے اوروں کے عیب وہنر

پڑی اپنی برائی پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب اپنی برائی پر نظر پڑی تو پتہ چلا کہ کوئی برا نہیں ہے، سب سے برا میں

ہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے نفس کے عیوب پر نگاہ ڈالنے کی اور ان کے ادراک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

غیبت کا ایک عملی علاج

بہر حال، غیبت کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کی تشریح عرض کرتا ہوں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ:

"سالک کے سامنے کوئی غیبت یا لایعنی کلام کرے اور اس کو منع کرنے پر قدرت نہ ہو تو خود اٹھ جانا چاہئے اور اس کی دل شکنی کا خیال نہ کرے، کیونکہ دوسرے کی دل شکنی سے اپنی دین شکنی زیادہ قابل احتراز ہے، یوں اگر نہ اٹھ سکے تو کسی بہانہ سے اٹھ جائے یا قصداً فی الفور کوئی مباح تذکرہ شروع کر دیا جائے تاکہ وہ قطع ہو جائے"۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۹)

جیسا کہ ابھی بتایا کہ غیبت جس طرح کرنا ناجائز ہے، اسی طرح سننا بھی ناجائز ہے۔ لہٰذا اگر مجلس میں غیبت شروع ہو گئی تو اب کیا کیا جائے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ اگر منع کرنے پر قدرت ہے تو روک دے، روکنے کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ تو یہ ہے کہ صاف صاف کہہ دے کہ دیکھو اس طرح تذکرہ کرنے سے غیبت ہو جائے گی، چھوڑو اس تذکرے کو۔ اور اگر اس طرح نہیں کہہ سکتے تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خود موضوع کلام بدل دے اور کوئی اور بات چھیڑ دے تاکہ وہ قصہ ختم ہو جائے۔ اور اگر ان دونوں طریقوں پر قدرت نہ ہو تو پھر وہاں سے اٹھ جائے، اس مجلس میں نہ بیٹھے۔

دل شکنی کی پرواہ نہ کرے

آگے ایک اصول بیان فرمادیا کہ اس کی دل شکنی کا خیال نہ کرے، کیونکہ دوسرے کی دل شکنی سے اپنی دین شکنی زیادہ قابل احتراز ہے۔ ہمارے ہاں افراط اور تفریط حد درجے کی ہے، ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ حقوق العباد کی پرواہ ہی نہیں، جس کا جو حق چاہا مار لیا، چاہے وہ جانی حق ہو یا مالی حق ہو۔ اور دوسری طرف یہ ہے کہ اگر کسی کو حقوق العباد کا خیال ہے تو وہ اس درجہ اس کے اندر آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں اپنے فرائض شرعیہ کے اندر کوتاہی کرنا شروع کر دیتا ہے۔

وقت پر نماز پڑھنا فرض ہے

چنانچہ ایک ڈاکٹر صاحب تھے، ان کی بیوی نے مجھ سے بتایا کہ میرے شوہر ویسے تو بہت اچھے ہیں، لیکن مطب کے اوقات میں نماز نہیں پڑھتے، میں ان سے کہتی ہوں کہ مطب کے اوقات کے دوران جب نماز کا وقت آئے تو نماز پڑھ لیا کرو، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ میں تو لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں اور یہ حقوق العباد میں سے ہے، مطب میں مریض بیٹھے ہوں اور میں اپنی نماز شروع کر دوں؟ چنانچہ وہ مطب بند کر کے رات کو جب گھر آتے ہیں تو عصر، مغرب اور عشاء تینوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں تو خدمت خلق کرتا ہوں، اور خدمت خلق کے دوران نمازیں قضا ہو جائیں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

بھائی! خدمت خلق تم پر اس طرح فرضِ عین نہیں جس طرح نماز فرض

عین ہے۔ دوسرے اس خدمت خلق کے ساتھ نماز کا کوئی تعارض بھی نہیں ہے، اگر تم عصر کی چار رکعت پڑھ کر دوبارہ مریضوں کو دیکھنا شروع کردو تو اس میں کیا تکلیف ہوگی؟ لہٰذا نفس نے نمازیں قضا کرنے کا ایک بہانہ تلاش کرلیا کہ خدمت خلق ہو رہی ہے۔ یہ سب افراط اور تفریط ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ دین کی صحیح فہم اور سمجھ نہیں۔ اسی لئے حضرت فرماتے ہیں کہ دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کی خاطر اپنے دین کو توڑ دینا ٹھیک نہیں۔ لہٰذا یہ خیال کرنا کہ میں اگر اس کو غیبت سے روکوں گا تو اس کا دل برا ہوگا، یا میں اٹھ کر چلا جاؤں گا تو اس کا دل برا ہوگا، یاد رکھئے! اگر معصیت سے بچنے کے نتیجے میں دوسرے کا دل برا ہوتا ہے تو ہونے دو، اس کی پرواہ ہی مت کرو۔ تم اس حد تک مکلّف ہو کہ جائز حدود میں رہ کر اس کی دل شکنی سے بچو، لیکن جہاں دل شکنی سے بچنے کے لئے کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے تو پھر دل ٹوٹتا ہے تو ٹوٹنے دو، اس کی پرواہ نہ کرو۔

دوسروں کی دنیا بنانے والا

ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دوسرے کو دنیا کا فائدہ پہنچانے کے لئے اپنی آخرت خراب کرے تو اللہ تعالیٰ اس دوسرے شخص کو دنیا ہی میں اس پر مسلط کر دیتے ہیں کہ تو نے اس کی دنیا کی خاطر اپنی آخرت خراب کی تھی، اب یہ تیری دنیا کو بھی خراب کریگا۔ جو لوگ بیوی بچوں کو آرام اور راحت پہنچانے کی خاطر حرام آمدنی میں مبتلا ہوتے ہیں تو تجربہ یہ ہے کہ وہی بچے اس باپ کے سر پر جوتے بجاتے ہیں، اس لئے کہ اس نے بیوی بچوں کو راضی کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا، اور ان کی دنیا

بنانے کے لئے اپنی آخرت خراب کی، تو پھر دنیا کے اندر ہی ان کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کے لئے اپنی دین شکنی مت کرو۔

غیبت سے بچنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے

ایک اور حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق** کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کرنی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی نوبت آجائے، اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے نہ کسی کی بات ماننے کی ضرورت ہے اور نہ مخلوق کی دلداری کی اجازت ہے۔ یاد رکھئے! کوئی کام محنت کے بغیر نہیں ہوتا، ہر کام میں کچھ نہ کچھ محنت اور مشقت اٹھانی پڑتی ہے، تب جا کر وہ کام انجام پاتا ہے، لہٰذا اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ غیبت کرنا برا کام ہے اور گناہ کا کام ہے، اور تم یہ سمجھتے ہو کہ اس سے آخرت تباہ ہو رہی ہے تو پھر محنت اور مشقت اور اپنی ہمت کو استعمال کرنا پڑیگا۔ جب اپنی ہمت کو استعمال کرو گے تو اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے اور پھر اس گناہ سے بچنا آسان ہو جائے گا۔

ناجائز غیبت کی شرط ناگواری ہے

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ:

"اگر کسی کو بنا بر بے تکلفی ایسی بات کہی جائے جو بنظر الفاظ تو ناگواری کی بات ہے، مگر بنظر بے تکلفی یا تعلق یا بطور مزاح ہونے کے ناگواری کا خیال نہیں۔ (تو آیا یہ بھی ناجائز اور غیبت میں داخل ہے یا نہیں؟)

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۹)

مطلب ان سوال کرنے والے کا یہ تھا کہ کچھ لوگوں سے بے تکلف تعلقات ہوتے ہیں، دوستی ہے، آپس میں ہنسی مذاق ہے، اور ایک دوسرے کو کچھ باتیں ہنسی مذاق میں کہہ دیتے ہیں، اب اگر اس کی غیر موجودگی میں بے تکلفی کے انداز کا اس کا اسطرح ذکر کر دیا جائے کہ اس کے الفاظ تو بظاہر ایسے ہیں کہ جب دوسرا سنے تو اس کو ناگوار ہو کہ میرے بارے میں ایسے الفاظ کہے، لیکن تعلقات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کے ساتھ بے تکلف دوستی ہے، رشتہ داری ہے، تو آیا ایسے الفاظ کہنا جائز ہیں یا نہیں، یہ الفاظ غیبت میں داخل ہیں یا نہیں؟ جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ:

"جب وہ ناگواری ہے، خواہ کسی بھی حیثیت سے ہو، وہ مانعیت کے لئے کافی ہے، اور اگر خود ناگواری میں تردد ہے تب بھی واجب الکف ہے، البتہ اگر عدم ناگواری یقینی ہو تو غیبت کی حد سے خارج ہو گیا۔"

حضرت والا کے اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کا مکمل سو فیصد یقین ہو کہ جس کے بارے میں میں یہ بات کہہ رہا ہوں وہ اگر یہ سنے گا تو اس کو میرا یہ جملہ اور فقرہ اور یہ الفاظ ناگوار نہیں ہونگے، وہ ان کو برا نہیں سمجھے گا، کیونکہ تعلق کی نوعیت ایسی ہے تو اس صورت میں وہ الفاظ غیبت میں داخل نہیں۔ مثلاً اپنے کسی دوست سے کہا کہ تو بڑا بے وفا ہے، پھر بعد میں کسی مجلس میں اس دوست کا تذکرہ آیا تو اس نے کہا کہ اس بے وفا کا کیا اعتبار۔ اب لفظ "بے وفا" ایسا لفظ ہے کہ کسی اجنبی کو کہیں گے تو اس کو ناگواری بھی ہو سکتی ہے، لیکن دوستی میں جب یہ

لفظ بولا جاتا ہے تو عموماً ناگوار نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر اس بات کا یقین ہے کہ جب میرا دوست یہ سنے گا کہ میں نے اس کے بارے میں یہ بات کہی تھی تو اس کو ناگوار نہیں ہوگا تو یہ غیبت میں داخل نہیں۔ لیکن اگر ناگوار ہونے کا شبہ ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ ناگوار ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ ناگوار نہیں ہوگا تو اس کو ناجائز ہی سمجھیں گے۔

ایسا ہنسی مذاق جائز نہیں

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بعض اوقات دوستوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوست تو بے تکلفی میں دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہا ہے، اور اس کا مقصد دوسرے کو ستانا اور تکلیف پہنچانا نہیں ہے، لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہنسی مذاق کو پوری طرح برداشت نہیں کرپاتے اور اس پر وہ چڑتے ہیں اور انکو ناگواری ہوتی ہے۔ لیکن دوست احباب ایسے شخص کو چڑانے کے لئے اس سے اور زیادہ ہنسی مذاق کرتے ہیں اور اس سے مزہ لیتے ہیں، تو اگرچہ دوست احباب اس کو بے تکلفی میں وہ الفاظ کہہ رہے ہیں، لیکن چونکہ اس کو تمہاری یہ بے تکلفی ناگوار ہو رہی ہے تو یہ ہنسی مذاق بھی جائز نہیں، کیونکہ کسی مسلمان کو ناگواری پہنچانا جائز نہیں۔ لہٰذا ایسے آدمی سے اس طرح گفتگو کرنا جو اس کی دل شکنی کا باعث ہو، یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

لیکن اگر یہ یقین ہے کہ فلاں سے ایسی بے تکلفی کی دوستی ہے کہ وہ برا نہیں مانے گا بلکہ اس کو اچھا لگے گا، اور اس کو اس بے تکلفی سے خوشی ہوگی، تو

ایسے موقع پر اس کے سامنے بھی ایسے الفاظ کہنا جائز ہے اور پیٹھ پیچھے کہنا بھی جائز ہے۔ خلاصہ یہ کہ تین صورتیں ہوئیں، نمبر ایک: اگر ناگواری کا یقین ہو تو ایسے الفاظ کہنا ناجائز ہے، نمبر دو: اگر ناگواری کا شبہ ہو تو بھی ناجائز ہے، نمبر تین: اگر یہ یقین ہو کہ اس کو ناگوار نہیں ہوگا تو جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں غیبت سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ساتویں مجلس
غیبت سے بچنے کا طریقہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

ساتویں مجلس

غیبت سے بچنے کا طریقہ

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین، امابعد!

حضرت والا نے غیبت سے بچنے کے لئے ایک اصول ارشاد فرمایا، وہ یہ ہے کہ:

"بے سوچے ہرگز کوئی کلام نہ کیا جائے، اگرچہ بعض اوقات یہ بھی نہ یاد رہے گا کہ سوچ کر بولوں، مگر خیال رکھنے سے اکثر اوقات یاد رہے گا کہ سوچ کر بولوں، پھر انشاء اللہ ذھول نہ ہوگا، پس جب سوچ کر بولا جائے تو ہر کلام سے پہلے یہ سوچ لینا چاہئے کہ اس کلام سے گناہ تو نہ ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی" (انفاس عیسیٰ ص ۱۲۹)

یعنی بے سوچے سمجھے بولنے کی جو عادت پڑی ہوئی ہے، اس کو ختم کرو، بولو تو سوچ کر بولو، اور یہ سوچو کہ جو کلمہ میں زبان سے نکالنا چاہتا ہوں، وہ کہیں مجھے گناہ میں اور اللہ کی نافرمانی میں مبتلا نہ کر دے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "قُلْ خَیْرًا وَاِلاَّ فَاصْمُتْ" یا تو بھلائی کی بات کہو ورنہ خاموش رہو۔ خاموش رہنا ہزار درجہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ آدمی فضول ایسی باتیں کرتا

پھرے جواس کے لئے عذاب جہنم کا باعث ہوں۔

جہنم میں اوندھے منہ ڈالنے والی

حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ھَل یَکُبُّ النَّاسَ فِی النَارِ اِلاَّ حَصَائد اَلسِنَتِہِم"

یعنی لوگوں کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی چیز ان کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات ہونگے، العیاذ باللہ۔ یہ زبان سرکاری مشین ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے عطا فرمادی ہے، جب سے پیدا ہوئے اس وقت سے یہ مشین چل رہی ہے اور مرتے دم تک چلتی رہے گی، نہ اس میں تیل ڈالنے کی ضرورت، نہ اس کی سروس کرانے کی ضرورت، نہ اس کی مرمت کرانے کی ضرورت، مگر یہ کام کررہی ہے، اور اس طرح کام کررہی ہے کہ جیسے ہی ذہن میں ایک بات آئی کہ یہ بات زبان سے ادا کروں، بس فوراً وہ بات زبان کے ذریعہ باہر آجاتی ہے، گویا کہ آٹومیٹک مشین ہے۔ اس نعمت کی ہمیں قدر اس لئے نہیں ہے کہ یہ نعمت بچپن سے ہمارے ساتھ ہے اور کام دے رہی ہے، اور اس کے حصول کے لئے کوئی روپیہ پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑا، اور کوئی محنت نہیں اٹھانی پڑی، اس لئے اس کی قدر نہیں۔

زبان کی قدر کریں

اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھئے جن کی گویائی کی قوت سلب ہوچکی ہے کہ وہ کس عذاب کے اندر مبتلا ہیں؟۔ جن لوگوں کی فالج کی وجہ سے زبان بند ہوجاتی ہے، وہ بات کہنا چاہتے ہیں، اپنی بیوی بچوں سے، اپنے ماں باپ سے، اپنے بھائی

سے، اپنے دوست سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، لیکن قوت گویائی نہیں ہے، بول نہیں سکتے۔ بعض اوقات اپنا سر پیٹ لیتے ہیں کہ میں کہنا چاہتا ہوں، میں اپنے دل کی بات اس کو کیسے سمجھاؤں، اس وقت پتہ چلتا ہے کہ اس زبان کی گویائی کی کیا قیمت ہے۔ خدانہ کرے، اگر ہم میں سے کسی کی گویائی دو منٹ کے لئے بند ہو جائے، اور بولنے کی طاقت نہ رہے، اور دوسرا شخص کہے کہ تمہارے بولنے کی طاقت تمہیں واپس نہیں مل سکتی، پہلے اس کے لئے تمہیں خرچ کرنا پڑے گا تو لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا تاکہ مجھے یہ قوت گویائی واپس مل جائے۔ اب اس وقت یہ گویائی مفت ملی ہوئی ہے، اور یہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے، اور انسان اس کو جابجا استعمال کر رہا ہے، اور اس کے ذریعہ حلال اور حرام ایک کر رکھے ہیں، کوئی فکر نہیں۔

دو عظیم کلمے:

شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ سرکاری مشین تمہیں مفت ملی ہوئی ہے اور کام دینے والی مفید چیز ہے تو اس کو فائدے کے کاموں میں استعمال کرو اور حرام کاموں سے اس کو بچاؤ۔ اگر انسان اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اس کا فائدہ بھی بڑا عظیم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر ایک مرتبہ زبان سے "سبحان اللہ" کہہ دیا یا "الحمد للہ" کہہ دیا تو میزان عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے۔ بخاری شریف کے ختم کے موقع پر آپ یہ حدیث سنتے ہیں کہ: كلمتان حبيبتان الى الرحمن خفيفتان على اللسان ثقيلتان فى الميزان، سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم" دو کلمے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بڑے محبوب

ہیں۔ جن کا زبان سے ادا کرنا بہت آسان ہے، ایک لمحے میں ادا ہو جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی یہاں میزان عمل میں بڑے بھاری ہیں وہ دو کلمے یہ ہیں "سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم" لہٰذا اگر انسان اس زبان کو صحیح استعمال کرلیں تو جنت کی نعمتوں کے ڈھیر لگا سکتا ہے۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے انسان اس زبان کو اللہ کے ذکر سے تر رکھے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ سب سے افضل عمل کونسا ہے؟۔ آپ نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل عمل یہ ہے کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر کرتے رہو گے تو تمہارے نامہ اعمال میں اضافہ ہوتا رہے گا، نیکیوں کے ڈھیر لگتے رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب کا خزانہ اکٹھا ہوتا رہے گا۔

اسلام میں داخل کرنے والی چیز

یہی زبان ہے جو انسان کو کفر سے نکال کر اسلام میں داخل کر دیتی ہے، ایک ستر برس کے کافر کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دیدی اور اس نے زبان سے "اشھد أن لا إله الا الله و أشھد ان محمداً رسول الله" کہہ دیا تو وہ ستر برس کا کافر جہنم کے ساتویں طبقے سے نکل کر ایک لمحے میں جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا۔ یہ کس کی بدولت ہوا؟ اس زبان کی بدولت ہوا، اللہ تعالیٰ نے اس زبان میں یہ تاثیر رکھی ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص کی ساری عمر کفر میں، فسق و فجور میں اور بد اعمالیوں میں گزری، آخر میں اللہ تعالیٰ نے

ایمان کی توفیق دیدی اور اس نے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔ کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اب اگر کلمہ شہادت پڑھنے سے ذرا دیر پہلے انتقال ہو جاتا تو سیدھا جہنم میں جاتا، لیکن، جب اس کلمہ کے پڑھنے کے بعد انتقال ہوا تو سیدھا جنت میں چلا گیا۔ اس کلمہ نے اس کو جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔

☆☆☆

زبان کا فائدہ اور نقصان دونوں عظیم ہیں

لہٰذا اگر چاہو تو اس زبان کے ذریعہ آخرت کا ذخیرہ جمع کرلو۔ تلاوت کے ذریعہ، ذکر و تسبیح کے ذریعہ، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے ذریعہ، شکر کے ذریعہ اور کسی مسلمان بھائی کا دل خوش کرنے کے ذریعہ آخرت کے لئے ذخیرہ جمع کرلو۔ کیونکہ زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکالنا جس سے دوسرے مسلمان بھائی کا دل خوش ہو جائے، یہ بھی صدقہ ہے۔ اور اگر زبان کو غلط استعمال کیا جائے تو اس کا نقصان بھی بہت ہے، جیسا کہ پہلے یہ حدیث سنائی کہ لوگوں کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی چیز اس زبان کے کرتوت ہوں گے، کیونکہ جھوٹ یہ بول رہی ہے، غیبت یہ کر رہی ہے، دل آزاری یہ کر رہی ہے، فحش کلامی یہ کر رہی ہے، اور یہ سب کام انسان کو جہنم کے اندر اوندھے منہ گرانے والے ہیں۔ لہٰذا جب اس زبان کا فائدہ بھی عظیم ہے اور نقصان بھی عظیم ہے تو عافیت اور نجات کا راستہ یہی ہے کہ آدمی سوچ سمجھ کر زبان کو استعمال کرے۔ اسی لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب کوئی کلمہ بولو، تو بولنے سے پہلے سوچو کہ یہ کلمہ مجھے جنّت میں لے جارہا ہے یا جہنّم میں لے جارہا ہے۔

امام شافعیؒ کا جواب سے پہلے خاموش رہنا

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص آکر ان سے سوال کرتا تو بعض اوقات امام صاحب دیر تک خاموش رہتے، کوئی جواب نہ دیتے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! اتنی دیر ہوگئی، آپ کچھ بول ہی

نہیں رہے، کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں! جواب میں فرمایا:

حتّیٰ أعرف أن الفضل فی السکوت أوفی الکلام

میں اس لئے خاموش ہوں کہ پہلے یہ دیکھ لوں کہ خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے یا بولنا زیادہ بہتر ہے۔

لہٰذا پہلے تول رہے ہیں کہ اب جو کلمہ بولوں گا، یہ میرے لئے فائدہ مند ہوگا یا نقصان دہ ہوگا۔ پہلے تولو پھر بولو۔ جو کلمہ زبان سے نکالو، تول کر نکالو کہ یہ کلمہ کیسا ہے اور کتنا ہے؟ اور اس سے مجھے فائدہ پہنچے گا یا نقصان پہنچے گا؟

زبان کی حفاظت پر جنّت کی ضمانت

اسی لئے حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من یضمن لی مابین لحییه و ما بین رجلیه اضمن له الجنة"

جو شخص مجھے دو چیزوں کی ضمانت دیدے، میں اس کو جنّت کی ضمانت دیتا ہوں۔

کونسی دو چیزیں؟ ایک وہ چیز جو جبڑوں کے درمیان ہے یعنی زبان، اس کی ضمانت دیدے کہ وہ اس کو غلط استعمال نہیں کرے گا۔ اور ایک وہ چیز جو ٹانگوں کے درمیان ہے یعنی شرمگاہ، کہ اس کو غلط استعمال نہیں کرے گا، میں اس کو جنّت کی ضمانت دیتا ہوں۔

لہٰذا یہ نہ ہو کہ یہ سرکاری مشین مفت میں مل گئی ہے تو اب صبح سے شام

تک قینچی کی طرح چل رہی ہے اور رکنے کا نام نہیں لیتی، جو منہ میں آرہا ہے بک رہے ہیں، کوئی سوچ و فکر نہیں۔ یہ حالت ٹھیک نہیں، بلکہ بولنے سے پہلے سوچو کہ جو بات میں منہ سے نکالنے والا ہوں وہ فائدہ پہنچائے گی یا نقصان پہنچائے گی؟ اس کے بعد زبان سے بات نکالو۔

فضول گوئی پر دو طالب علموں کا واقعہ

دھلی میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ ان کی نازک مزاجی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ دو طالب علم ان سے بیعت ہونے کے لئے "بلخ" سے آئے۔ بلخ افغانستان کا ایک شہر ہے۔ وہاں انہوں نے یہ سنا کہ دھلی میں یہ بڑے بزرگ اور اللہ والے ہیں، تو دل میں خیال آیا کہ ان سے بیعت ہونا چاہئے۔ چنانچہ بلخ سے طویل سفر کر کے دھلی پہنچے، حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی مسجد میں پہنچے، نماز کا وقت قریب تھا اس لئے حوض پر بیٹھ کر دونوں وضو کرنے لگے، وضو کرتے وقت آپس میں باتیں کرنے لگے کہ یہ حوض بڑا ہے یا ہمارے بلخ کی مسجد کا حوض بڑا ہے؟ ایک نے کہا کہ یہ حوض بڑا ہے، دوسرے نے کہا وہ بڑا ہے، اور آپس میں بحث ہونے لگی، حضرت مرزا صاحب نے وہاں سے گزرتے ہوئے ان کی گفتگو سن لی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت مرزا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ ہم بلخ سے آئے ہیں، حضرت والا نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ کہا کہ ہم آپ کے دست مبارک پر بیعت ہونے آئے ہیں۔ حضرت مرزا صاحبؒ نے فرمایا

کہ بیعت ہونے تو آپ آئے ہیں، لیکن کیا اس کا فیصلہ ہو گیا کہ یہ حوض بڑا ہے یا بلخ کا حوض بڑا ہے؟ اب دونوں خاموش، شرمندہ ہو رہے تھے کہ حضرت والا نے ہماری گفتگو سن لی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ ابھی فیصلہ نہیں ہوا تو ایسا کرو کہ بیعت تو تم بعد میں ہونا، پہلے بلخ جاؤ اور اس حوض کو ناپ کر آؤ، اور واپس آکر پھر اس حوض کو ناپو، اور پھر فیصلہ کرو کہ کونسا حوض بڑا ہے اور کونسا حوض چھوٹا ہے، اس کے بعد بیعت ہونا۔

کیونکہ تمہاری بحث اور گفتگو سے پتہ چلا کہ تمہاری گفتگو میں اوّل تو تحقیق نہیں، احتیاط نہیں، ایک نے ناپے تولے بغیر یہ دعویٰ کر دیا کہ یہ حوض بڑا ہے، اور دوسرے نے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ حوض بڑا ہے، اور آپس میں بحث شروع کر دی، اس سے معلوم ہوا کہ طبیعت میں احتیاط نہیں۔ دوسرے یہ کہ بے کار اور بے فائدہ گفتگو کی عادت پڑی ہوئی ہے، اگر یہ پتہ چل جاتا کہ یہ بڑا ہے یا وہ بڑا ہے تو اس سے دنیا یا آخرت کا کیا فائدہ حاصل ہوتا؟ لہٰذا واپس بلخ جاؤ اور وہ حوض ناپ کر آؤ۔ اس کے بغیر بیعت نہیں کروں گا۔

علاج کا فائدہ

پہلے زمانے میں ایسے ہی علاج ہوا کرتے تھے۔ اب یہ علاج تو بڑا سخت اور کڑوا ہوا، لیکن ساری زندگی کیلئے یہ علاج کافی ہو گیا ہوگا، پھر اس کے بعد ساری عمر بلا تحقیق اور بے فائدہ بات زبان سے نہیں نکلی ہوگی۔ بہر حال۔ اس طرح کے علاج ہوتے تھے، یہ نہیں کہ ذکر و تسبیحات بتا دیں اور اب بیٹھے ہوئے تسبیح گھونٹ

رہے ہیں، بس وظیفہ گھونٹنے سے ہی کامل بن گئے، بلکہ اس طرح رگڑے دیے جاتے تھے، تب جاکر اصلاح ہوتی تھی۔

علاج سخت ہونے پر اشکال اور جواب

یہ واقعہ سنا کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان طلبہ نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ ایک غلط کام کیا، اگر غلط کام نہ کر رہے ہوتے تو پھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی، یہ طلبہ اسی لئے تو آئے تھے کہ اپنی اصلاح کرائیں، اگر پہلے سے کامل ہوتے اور زبان قابو میں ہوتی، خیالات قابو میں ہوتے، تو شیخ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ لہٰذا اس غلطی پر شیخ نے بیعت کرنے سے کیوں انکار کر دیا؟ پہلے بیعت کر لیتے اور پھر علاج کرتے۔

پھر خود ہی حضرتؒ نے اس اشکال کا جواب دیا کہ یہاں دو باتیں ہیں: پہلی بات یہ ہے کہ اس انکار سے یہ بتلانا منظور ہے کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ طالب، سالک اور مرید کو پہلے سے ان کا دھیان اور ان کی فکر ہونی چاہیئے۔ شیخ سے فائدہ اسی وقت ہوتا ہے کہ جب مرید نے پہلے سے بڑے بڑے امور کا دھیان اور خیال کیا ہوا ہے، البتہ جو دقائق اور باریک باتیں ہیں، ان کی اصلاح شیخ سے کرانی ہے، اس وجہ سے شیخ بیعت کرنے سے انکار کر دیتا ہے کہ تمہیں ابھی بیعت نہیں کرنا ہے۔

ہر شخص کا علاج علیحدہ ہوتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی شیخ کے قلب پر وارد فرماتے ہیں کہ

اس شخص کے ساتھ اس وقت کیا معاملہ کرنا ہے، ہر آدمی کا علاج الگ ہوتا ہے، کسی کا علاج تھپڑ مارنے سے ہو جاتا ہے، کسی کا علاج ڈانٹ دینے سے ہو جاتا ہے، کسی کا علاج پیار کرنے سے ہوتا ہے، کسی کا علاج چمکارنے سے ہو جاتا ہے، اور کسی کا علاج صرف ایک نظر دیکھ لینے سے ہو جاتا ہے۔ اب اللہ جل جلالہ شیخ کے دل پر یہ وارد فرماتے ہیں کہ اس شخص کے لئے اس وقت کیا چیز فائدہ مند ہے۔ دوسرا آدمی دیکھ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ شیخ صاحب نے کچھ زیادتی کر دی، لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اسی میں رکھی ہے۔

میرے والد ماجدؒ کا طرز عمل

ہم نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے طرز عمل میں یہ چیز بارہا مشاہدہ کی، حالانکہ وہ انتہائی نرم خو آدمی تھے، غصہ تو نہ ہونے کے برابر تھا، ہر ایک کے ساتھ نرمی اور تحمل سے پیش آتے تھے، تواضع اور انکساری کے ساتھ ملتے، لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ اچانک کسی شخص پر چھوٹی سی بات پر شدید غصہ ہو جاتے، اب ظاہر بین کو یہ دیکھ کر شبہ ہوتا کہ انہوں نے اس شخص پر زیادتی کی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نیک بندوں کے قلب پر وارد فرماتے ہیں کہ کس شخص کے ساتھ کس وقت کیا معاملہ کرنا ہے۔

ایک صاحب کو ڈانٹنے کا واقعہ

چنانچہ ان کا ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک بڑے صاحبِ حیثیت، پڑھے لکھے مشہور آدمی، والد صاحب سے ملاقات کے لئے آگئے اور بات کرنی

شروع کی، ابھی دو تین جملے ہی کہے تھے کہ والد صاحبؒ نے ان کو شدید ڈانٹنا شروع کر دیا، میں بھی حیران ہو گیا کہ آج تک کبھی کسی کو اس طرح نہیں ڈانٹا، یہاں تک کہ ان سے یہ کہہ دیا کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ چنانچہ ان کو دفتر سے نکال دیا۔ آج تک میں نے ایسا منظر نہیں دیکھا تھا، میں نے سوچا کہ یا اللہ یہ شخص تو کام سے گیا، اس لئے کہ نو تعلیم یافتہ آدمی ہے، کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہے، ڈاڑھی بھی برائے نام ہے، اور حضرت والد صاحبؒ نے اس کو ڈانٹ دیا، اب ہمیشہ کے لئے یہ شخص متنفر ہو کر جائے گا۔ اسی آدمی نے بعد میں خود اپنی زبان سے مجھے کہا کہ مفتی صاحبؒ کی اس دن کی ڈانٹ نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی اور میرے اوپر اس ڈانٹ نے ایسا اثر کیا کہ میرا مرکز توجہ ہی بدل گیا۔

بہر حال، اللہ تعالیٰ ہی اپنے نیک بندوں کے دلوں پر یہ القاء فرماتے ہیں کہ کس کے ساتھ کس وقت کیا معاملہ کرنا چاہیئے۔ کسی اللہ والے کے طرزِ عمل پر شبہ مت کرو کہ کسی شخص کو ڈانٹ رہے ہیں، کسی کو پھٹکار رہے ہیں، اور کسی سے محبت سے پیش آ رہے ہیں۔ کیونکہ معطی حقیقی اور مبدأ فیاض تو اللہ تعالیٰ ہیں، شیخ تو ایک واسطہ ہوتا ہے، وہی شیخ کے دل میں ڈالتے ہیں کہ اس کی اصلاح کا کیا طریقہ مناسب ہو گا، ہر ایک کو ایک ہی نسخہ نہیں پلایا جاتا۔ اس لئے کبھی ان اللہ والوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔

لہٰذا حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے ان دو طالب علموں کو یہ سزا دی کہ واپس بلخ جاؤ اور وہاں کا حوض ناپ کر آؤ۔ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ ان کا علاج یہی ہے۔ ایک مرتبہ جب چوٹ لگ جائے

گی تو ساری عمر کے لئے کار آمد ہو جائے گی، چنانچہ کار آمد ہو گئی۔ اور اس سے حضرت مرزا صاحب نے ان کو یہ سبق دیا کہ تم زبان کو احتیاط سے استعمال نہیں کرتے اور احتیاط ضروری ہے۔

پہلے سوچو پھر بولو

اور اس احتیاط کرنے کا طریقہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتا دیا کہ پہلے سوچو کہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس میں حدود سے تجاوز تو نہیں ہے؟ اس میں جھوٹ تو شامل نہیں ہے؟ اس میں مبالغہ تو نہیں ہے؟ بے احتیاطی تو نہیں ہے؟

آج بہت سے فسادات اور جھگڑے صرف اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ ایک شخص نے بے سوچے سمجھے اِدھر کی بات اُدھر کہہ دی، تحقیق کی نہیں اور صحیح طور پر یاد رکھا نہیں، بس اس ایک بات کی وجہ سے خاندان میں فسادات کھڑے ہو گئے۔ لہٰذا پہلے سوچو کہ کیا بات کہی گئی ہے؟ کتنی مقدار میں کہی گئی ہے؟ اگر آگے نقل کرنی ہے تو بس اتنی ہی نقل کرو، اپنی طرف سے اس میں اضافہ نہ کرو۔

حضرت فرماتے ہیں کہ چونکہ زبان کو تو ہر وقت چلنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، وہ رکنے کا تو نام نہیں لیتی، تو اب کس وقت کس طرح سوچے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ ہر کام مشق کرنے سے ہوتا ہے، لہٰذا مشق کرو، اور شروع میں تو سوچنے کا خیال ہی نہیں آئے گا، لیکن سوچنے کا تھوڑا سا اہتمام کرو تو رفتہ رفتہ

عادت پڑجائے گی۔ اگر شروع میں سوچنا بھول جاؤ، تو جب یاد آئے اس وقت سوچو، پھریاد آئے، پھر سوچو، اس طرح کرتے کرتے سوچنے کی عادت پڑجائے گی، پھر بے تکلف سوچنا آئے گا، اور سوچنے کے لئے کسی خاص اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ پھر جو بات نکالو گے بالکل درست نکلے گی۔ غیبت، جھوٹ اور دل آزاری سب سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے۔

غیبت کو جائز کرنے کیلئے نفس کی تاویل

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ:

"میرا نفس مجھے یہ تاویل سکھاتا ہے کہ تیری بھی تو لوگ غیبت کرتے ہیں، قیامت میں جب پکڑ ہوگی تو اپنے مغتابین (غیبت کرنے والوں) سے جو اجر ملے گا وہ اجر جن کی تو نے غیبت کی، ان کو دیدیا جائے گا۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵۰)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو آدمی کسی کی غیبت کرے تو اس کا اجر اس کو دیدیا جاتا ہے، ایک حدیث شریف ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ: جس کی غیبت کی گئی۔ اس لئے میرے دماغ میں یہ بات آتی ہے کہ میری بھی لوگ غیبت کرتے ہیں اور میں بھی کرتا ہوں، جو لوگ میری غیبت کرتے ہیں ان کا اجر مجھے ملتا ہے، میں دوسروں کی غیبت کرتا ہوں تو میرا اجر ان کو مل جاتا ہے، لہٰذا معاملہ برابر سرابر ہوگیا، اس لئے زیادہ پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس تاویل کا جواب

جواب میں حضرت والاؒ نے فرمایا:

اوّل تو یہ کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ وہ اجر جو دوسروں سے ملا ہوا ہے اس کے تدارک کے لئے کافی ہے، ممکن ہے کہ یہ دوسروں سے ملا ہوا اجر تمہارے ہی پاس رہے، اور خاص تمہارے اعمال کا اجر اہل حقوق کو ملے اور نجات کے لئے دوسروں کا اجر کافی نہ ہو۔ دوسرے اس سے قطع نظر کر کے مساوات کی کوئی دلیل نہیں، ممکن ہے کہ تم کو کم ملے اور تم سے زیادہ لے لیا جائے تو تدارک کے لئے کیسے کافی ہو جائے گا؟ (ایضاً)

یعنی تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ تمہیں جو اجر مغتابین سے حاصل ہوا ہے، وہی دوسروں کے پاس جائے گا، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری نمازیں، تمہارے روزے، تمہاری تلاوت، تمہارا ذکر وغیرہ وہ سب تمہاری غیبت کے بدولت دوسروں کے پاس چلے جائیں اور دوسروں کا اجر تمہارے پاس آجائے۔ دوسرے تمہارے پاس مساوات کی بھی کوئی دلیل نہیں کہ جتنا اجر تمہیں ملا ہے، اتنا ہی اجر دوسروں کے پاس جائے گا، ممکن ہے کہ تمہیں کم اجر ملے اور تم سے زیادہ لے لیا جائے۔

یہ سب شیطانی تاویلات ہیں

یہ سب شیطان کی تاویلیں ہیں، جو انسان کو غلط کاموں میں مبتلا کرنے کے لئے دل میں ڈالتا ہے کہ ایسا کرلو، اور اس طرح معاملہ سیدھا ہو جائے گا۔

اللہ بچائے، جب آخرت میں اجر و ثواب کا معاملہ ہوگا اور اپنا اجر و ثواب دوسروں کے پاس جائے گا تو اس وقت پتہ چلے گا کہ یہ کتنی زبردست دھوکے کی تاویل تھی، اچھے خاصے نیک اعمال کئے، نمازیں پڑھیں، روزے اور تلاوت کے ساتھ رمضان المبارک گزارا، اعتکاف کرنے کی توفیق ہوئی، رات بھر جاگ جاگ کر عبادات اور نوافل ادا کرتے رہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ سارے اعمال دوسروں کے قبضے میں جارہے ہیں اور جو کچھ کیا کرایا تھا وہ سب دوسروں کے پاس چلا گیا۔ اس وقت جو حسرت اور تکلیف ہوگی، اس کا کوئی علاج نہیں۔ لہٰذا یہ سوچنا کہ آخرت میں حساب برابر ہو جائے گا، یہ خیال اور سوچ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، آمین۔

غیبت کا علاج ہمّت اور استحضار ہے

آگے حضرت والاؒ نے فرمایا:

"غیبت" ایک اختیاری امر ہے، اس کا طریق علاج ہمّت و استحضار ہے اور معینِ طریق یہ ہے کہ جب ایک بار ایسا ہو جائے ایک وقت فاقہ کرے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵۰)

سب سے پہلے یہ فرمایا کہ غیبت اپنے اختیار سے ہوتی ہے، کبھی بے اختیار نہیں ہوتی، اگر غیبت بے اختیار ہوتی تو حرام نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا کام حرام نہیں کیا جس سے بچنا انسان کے اختیار میں نہ ہو۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا

لہٰذا غیبت سے بچنا اختیار میں تو ہے، البتہ اس سے بچنے کے لئے ہمت اور استحضار کی ضرورت ہے۔ یہ ہمت کرلے کہ میں یہ گناہ نہیں کروں گا، زبان سے غلط بات نہیں نکالوں گا۔ اور اس بات کا استحضار کرے کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے، کتنا بڑا گناہ ہے اور اس کے نتیجے میں اپنے اچھے اعمال دوسروں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ ان چیزوں کا استحضار کرے۔

غیبت پر اپنے نفس کو سزا دینا

آگے فرمایا کہ اس سے بچنے میں یہ چیز معاون ہو جاتی ہے کہ آدمی یہ طے کرلے کہ اگر آئندہ غیبت ہوگی تو اپنے آپ کو یہ سزا دوں گا۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ وہ سزا نہ تو اتنی معمولی ہو کہ آدمی کو اس کی پرواہ ہی نہ ہو، جیسے میرے والد صاحبؒ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ جب "علیگڑھ کالج" قائم ہوا تو اس وقت یہ قانون تھا کہ تمام طلبہ کو نماز پڑھنا لازم ہے، اور نماز چھوڑنے پر جرمانہ مقرر تھا کہ جو طالب علم نماز چھوڑے فی نماز دو آنے ادا کرے، اب ہوتا یہ تھا کہ بہت سے طالب علم ایسے بھی تھے جو مہینہ بھر کا جرمانہ اکٹھا شروع میں جمع کرادیا کرتے تھے۔ چونکہ جرمانہ ایسا تھا کہ اس کو ادا کرنے میں کوئی خاص مشقت نہیں تھی اس لئے اس

جرمانہ لگانے سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ جرمانہ ایسا ہونا چاہئے جس سے کچھ مشقت ہو اور وہ جرمانہ اتنا بھی سخت نہ ہو کہ آدمی اس کو برداشت نہ کر پائے اور پھر آدمی اصل عمل سے بھی جائے اور جرمانہ سے بھی جائے، لہٰذا جرمانہ درمیانہ درجے کا ہونا چاہئے۔

غیبت کرنے پر نفس کو فاقہ کرانا

لہٰذا کسی کے حق میں مالی جرمانہ فائدہ مند ہوتا ہے کہ جب کبھی مجھ سے یہ فعل سرزد ہوگا تو میں اتنے پیسے صدقہ کروں گا۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جن پر صدقہ کرنا بڑا شاق ہوتا ہے، کیونکہ اس سے بھی انسان کے نفس کو سزا ملتی ہے۔ اور جن لوگوں کو پیسوں کی پرواہ نہیں ہوتی، انہیں چاہئے کہ وہ اپنے اوپر ایسا جرمانہ عائد کریں جس سے ان پر تھوڑی مشقّت ہو۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں یہ جرمانہ بیان فرمایا کہ آدمی یہ طے کرلے کہ اگر مجھ سے غیبت ہوگی تو ایک وقت کا فاقہ کروں گا، کھانا نہیں کھاؤں گا، بلکہ بھوک ہڑتال کروں گا۔ آج کل لوگوں نے بھوک ہڑتال کا الٹا طریقہ نکالا ہے کہ جب دوسرے پر دباؤ ڈالنا مقصود ہوتا ہے تو لوگ بھوک ہڑتال کرتے ہیں، اگر دوسرا شخص دباؤ قبول نہ کرے تو بھوک کی وجہ سے مر جائے، یہ طریقہ تو درست نہیں۔ حضرت والا نے جو طریقہ بیان فرمایا ہے وہ انسان کے اپنے اوپر دباؤ ڈالنے کے لئے بیان فرمایا کہ میں اس لئے فاقہ کر رہا ہوں تاکہ مجھ سے آئندہ غیبت سرزد نہ ہو، اور جب کبھی غیبت ہوگی تو اپنے نفس کو فاقے کی سزا دوں گا۔ اور یہ فاقہ ایسی چیز ہے کہ اگر

انسان اس پر عمل کرے تو چند دن میں علاج ہو جائے گا اور غیبت چھوٹ جائے گی۔

دوسروں کے عیوب ظاہر کرنے کا حکم

ایک صاحب نے حضرت والا سے سوال کیا کہ:

"بعض لوگ جو گناہ کبیرہ میں مبتلا ہیں، ان کے عیوب اور گناہ کو ظاہر کرنا غیبت ہے یا نہیں؟ نفس اس تاویل پر ہمیشہ آمادہ رہتا ہے کہ ایسوں کے عیوب اگر لوگوں پر ظاہر نہ کئے جائیں تو لوگوں کو دھوکا ہوگا اور مسلمانوں کو دھوکہ سے بچانا ضروری ہے"۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۰)

یعنی دوسروں کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ فلاں فلاں عیب میں مبتلا ہیں، اس عیب کی خبر لوگوں کو ہونی چاہئے تاکہ وہ اس سے دھوکہ نہ کھائیں، تو آیا ایسے آدمی کی غیبت کریں یا نہ کریں؟ جن صاحب نے یہ سوال کیا تھا وہ ابھی نئے نئے اس طریق میں داخل ہوئے تھے اور اپنی اصلاح کے لئے حاضر ہوئے تھے اور ابتداء ہی تھی کہ انہوں نے یہ سوال کرلیا۔ چنانچہ حضرت نے جواب تحریر فرمایا کہ:

مُبتدی جائز غیبت بھی نہ کرے

"یہ سوال منتہی کے قابل ہے، مبتدی کو جائز غیبت بھی نہ کرنی چاہئے۔" (ایضاً)

یعنی جو مبتدی ابھی اپنی اصلاح کرانے کے لئے چلا ہے اور ابھی اس نے اصلاح کے لئے قدم بڑھایا ہے، ابھی تو اس کے نفس کی تہذیب ہونی ہے، اس کو چاہئے کہ وہ جائز غیبت بھی نہ کرے۔ یہ وہی بات ہے جس کو حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال سے سمجھایا تھا کہ جیسے ایک کاغذ کو ایک طرف موڑ دیا جائے، پھر اس کو اگر سیدھا کرنا چاہو گے تو یہ سیدھا نہیں ہو گا، اس کے سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو الٹی طرف موڑو، جب الٹی طرف موڑو گے تو یہ سیدھا ہو جائے گا۔ اسی طرح انسان کا نفس بھی الٹی طرف مڑا ہوا ہے، اس کو ناجائز غیبت کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس عادت کو چھڑانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ شروع میں جائز غیبت بھی چھوڑے، پھر یہ نفس سیدھا ہو جائے گا، اور آئندہ صرف جائز غیبت ہی سرزد ہو گی، ناجائز غیبت سرزد نہ ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

آٹھویں مجلس

کیفیاتِ انفعالیہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

آٹھویں مجلس

الحمد للّٰہ رب العالمین ۔ والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ۔

أمّا بعد!

انفعالی کیفیت کے تقاضے پر عمل

ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ:

"اگر کوئی شخص میری بے جا غیبت کرتا ہے تو بشرط اطلاع اس شخص سے دل میں کدورت بلکہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔" (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۰)

یعنی جب مجھے پتہ چل جائے کہ فلاں شخص نے پیٹھ پیچھے میری برائی کی تھی تو اس شخص سے دل میں تکدّر پیدا ہو جاتا ہے بلکہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے، یعنی طبیعت میں اس کے خلاف غصّہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ ان صاحب کا حضرت والا کو یہ حال لکھنے کا منشا یہ تھا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو ٹھیک، اور اگر یہ خطرناک اور

قابلِ اصلاح بات ہے تو پھر اس کا علاج ہو جائے۔

جواب میں حضرت والاؒ نے فرمایا:-

"یہ دونوں کیفیتیں اِنفعال ہیں، اور انفعالات غیر اختیاری ہوتے ہیں، اور غیر اختیاری پر ذم و اثم نہیں (یعنی مذمت اور گناہ نہیں) البتہ ان کے مقتضیات کہ اس کی غیبت کرنے لگے اور اس کو ایذاء پہنچانے لگے و مثل ذالک، یہ افعال ہیں، اور افعال اختیاری ہوتے ہیں، اور ان میں سے بعض پر ذم واثم بھی ہوتا ہے، پس جب یہ کیفیات انفعالیہ حادث ہوں (یعنی پیدا ہوں) ان کے مقتضیات فعلیہ پر عمل نہ کیا جائے اور ان کے ازالے کی دعا کی جائے، یا اللہ! میرے یہ خیالات میرے دل سے نکل جائیں تاکہ مفضی الی الافعال نہ ہو جائیں، اور اپنے عیوب و ذنوب کا استحضار کیا جائے تاکہ اس کا جزم ہو جائے کہ میں تو اس شخص کی بدگوئی سے بھی زیادہ کا مستحق ہوں، اور افعال پر عقوبت کا بھی استحضار کیا جائے تاکہ داعیہ افعال کا مضمحل ہو جائے، اور ایک ہفتہ کے بعد پھر اطلاع دی جائے۔" (ایضاً)

بُرائی کا خیال دل میں آنا

اس ملفوظ میں حضرت والا نے ایک اصول بھی بیان فرمادیا اور اس پر عمل

کرنے کا طریقہ بھی بیان فرمادیا، اور مختصر لفظوں میں معاملے کی حقیقت پوری طرح واضح فرمادی۔ یہ بڑی کام کی بات ہے جو حضرت والاؒ نے یہاں بیان فرمائی ہے۔

وہ یہ کہ کسی برائی کا خیال خود بخود دل میں آجانا یہ ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، انسان کے اختیار کو اس میں دخل نہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر گرفت بھی نہیں ہے، گناہ بھی نہیں، یہاں تک کہ اگر شدید گناہ بلکہ (العیاذ باللہ) کفر و شرک کا خیال بھی دل میں آجائے، لیکن یہ خیال خود بخود آئے، تو محض اس خیال کا آجانا نہ تو موجب ملامت ہے یعنی وہ آدمی اس پر ملامت کا مستحق نہیں، نہ وہ سزا کا مستحق ہے، اور نہ ہی اس کا فعل گناہ ہے، کیونکہ غیر اختیاری طور پر یہ خیال اس کے دل میں آیا ہے۔

کیفیت انفعالیہ گناہ نہیں

اسی طرح کسی شخص کے کوئی عمل کرنے کے نتیجے میں دل کے اندر اگر کوئی تغیر پیدا ہوا جس کو "انفعال" کہا جاتا ہے۔ "انفعال" کا مطلب ہے کسی دوسرے کا اثر قبول کرنے کے نتیجے میں دل میں ایک حالت کا پیدا ہونا۔ مثلاً دوسرے نے گالی دی، اس کے نتیجے میں طبیعت کے اندر ایک جوش پیدا ہوا، اور غصہ آیا کہ اس نے مجھے گالی دی اور میرے خاندان کو برا کہا، اس غصہ اور جوش کے پیدا ہونے کو "انفعال" کہا جاتا ہے۔ یہ "انفعال" غیر اختیاری ہے، بلکہ طبعی ہے اور انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس لئے گناہ بھی نہیں۔

اس کے مقتضیات پر عمل گناہ ہے

بعض اللہ والے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نفس کو اتنا کچل چکے ہوتے ہیں کہ ان کو غصہ آتا ہی نہیں، دوسرے شخص نے برا بھلا کہہ دیا، لیکن اس سے طبیعت میں کوئی تغیر اور تأثر نہیں ہوا۔ یہ خاص بندے ہوتے ہیں، ریاضتوں اور مجاہدوں کے نتیجے میں ان کا نفس کچلا جاچکا ہوتا ہے۔

لیکن یہاں عام انسان کی بات ہو رہی ہے۔ جب ایک عام انسان کو برا بھلا کہا جائے گا، یا گالی دی جائے گی، تو اس کے نتیجے میں اس کے اندر تأثر پیدا ہوگا، یہ تأثر کوئی گناہ نہیں، اور نہ ہی اس پر سزا ہے، نہ اس پر ملامت ہے، نہ اس پر مؤاخذہ ہے۔ لیکن جو تأثر پیدا ہوا، اگر تأثر کا مظاہرہ کر دیا، مثلاً کسی نے گالی دیتے ہوئے کہا کہ تو خبیث ہے، آپ نے جواب دیا کہ "تو خبیث تیرا باپ خبیث" اس جواب دینے میں غصہ پر عمل کرتے ہوئے حد سے تجاوز کر گئے، تو صرف غصّہ آنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں تھا، کدورت پیدا ہونے پر کوئی مؤاخذہ نہیں تھا، بلکہ اس کدورت اور غصے کے نتیجے میں اگر برابر کا بدلہ لے لیتے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا، انشاء اللہ، لیکن جب بدلہ لینے میں ایک انچ آگے بڑھ گئے، تو بس اب پکڑ ہوگئی۔ کیونکہ جب آدمی اپنے غصے کے تقاضے پر عمل کرتا ہے تو اکثر و بیشتر حدود پر نہیں رہتا، بلکہ حدود سے متجاوز ہو جاتا ہے، یہ حد سے تجاوز کرنا بڑا خطرناک ہے، کیونکہ یہ اختیاری ہے اور اس پر آخرت میں پکڑ ہو جائے گی۔

معاف کرنے میں عافیت ہے

مثلاً اگر کسی نے آپ کو ایک مکّہ مار دیا، اب بدلہ لیتے ہوئے تول کر مکّہ مارنا کہ جتنی زور سے اس نے مکّہ مارا تھا، اتنا ہی زور کا مکّہ میں بھی ماروں، اس میں زیادتی نہ ہو جائے، اگر ترازو لے کر مارے گا تبھی ایسا کر سکے گا، ورنہ انسان کے بس میں نہیں کہ برابری کر سکے۔ اسی لئے اللہ کے نیک بندے کو جب کوئی مارتا ہے تو وہ بدلہ نہیں لیتے، اور وہ معاف کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں، کیونکہ اگر ذرا سا حد سے تجاوز کر گئے تو پکڑے جائیں گے۔

بزرگوں کے مختلف رنگ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "ارواحِ ثلاثہ" میں ایک قصّہ لکھا ہے کہ کسی شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ حضرت! یہ جو اللہ والے ہوتے ہیں ان کے الوان (رنگ) مختلف ہوتے ہیں، کسی کا کوئی رنگ ہے، کسی کا کوئی رنگ ہے، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ بزرگوں کے کیا کیا رنگ ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ ارے بھائی: چھوڑو، کس چکر میں پڑ گئے، مگر وہ صاحب ان بزرگ کے پیچھے ہی پڑ گئے، ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا ایسا کرو کہ فلاں گاؤں کی مسجد میں جاؤ، اس مسجد میں تمہیں تین بزرگ عبادت کرتے ہوئے نظر آئیں گے، تم پیچھے سے جا کر تینوں کو ایک ایک مکّہ مار دینا اور پھر مجھے آکر بتانا کہ کیا ہوا۔ چنانچہ وہ صاحب اس گاؤں کی مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ واقعۃً تین بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں، انہوں نے جا کر پہلے ایک کو مکّہ مارا، پھر دوسرے کو مارا، پھر تیسرے کو مارا۔ اور جب واپس

آئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ ہاں بھائی، کیا معاملہ پیش آیا؟

ان صاحب نے جواب دیا کہ واقعۃً بڑا عجیب معاملہ ہوا، وہ یہ کہ جب میں نے پہلے بزرگ کے مُکا مارا تو انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا، بلکہ اپنے ذکر واذکار میں لگے رہے۔ جب دوسرے کو مارا تو انہوں نے مڑ کر ایک مکا مجھے بھی مار دیا۔ جب تیسرے کو مُکا مارا تو وہ مُڑ کر میرا ہاتھ دبانے لگے کہ تمہارے ہاتھ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ پھر ان بزرگ نے فرمایا کہ تم جو یہ کہہ رہے تھے کہ مجھے اولیاء اللہ کے رنگ دکھائیں تو یہ مختلف رنگ تھے جو تم نے دیکھے۔

منزل کھوٹی ہوگی

پہلے بزرگ کا یہ رنگ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد میں لگے ہوئے ہیں، اگر اس دوران ایک شخص آکر مکا مار گیا تو کونسی قیامت آگئی؟ اب اگر میں منہ موڑ کر دیکھوں کہ کون مارنے والا ہے اور کیوں مارا؟ اور پھر اس سے بدلہ لینے کی فکر کروں تو اس سے میری یہ منزل کھوٹی ہوگی، اور جس کام میں میں لگا ہوا ہوں اس میں خلل واقع ہوگا، اس لئے انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کون مار رہا ہے۔ یہ ایک رنگ تھا۔

شفقت کی بنیاد پر بدلہ

اور جن بزرگ نے پلٹ کر مکا مارا اور بدلہ لے لیا، تو یہ بتاؤ کہ انہوں نے جو مکہ مارا وہ اتنا ہی زور کا مکہ مارا جتنا زور کا تم نے مارا تھا یا زیادہ زور سے مارا؟ ان صاحب نے جواب دیا کہ اتنا ہی زور کا مارا تھا۔ فرمایا کہ یہ دوسرا رنگ ہے، چونکہ

اللہ تعالیٰ نے بدلہ لینے کی اجازت دی ہے، اسلئے بدلہ لے لیا۔ اور بعض اوقات بدلہ لینا بھی اللہ والوں کی طرف سے شفقت کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اوقات کسی اللہ والے کو ستایا جائے اور اس ستانے کے نتیجے میں وہ صبر کرے، تو اس صبر کا نتیجہ بعض اوقات اس تکلیف دینے والے کے حق میں بہت برا ہوتا ہے۔ (العیاذ باللہ) کیونکہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

من عادیٰ لی ولیاً فقد آذنته بالحرب

یعنی جو شخص میرے کسی ولی کو ستائے تو اس کو میری طرف سے اعلان جنگ ہے۔ بہر حال، اس لئے ان بزرگ نے بدلہ لے لیا۔ یہ دوسرا رنگ تھا۔

تیسرا رنگ

تیسرے بزرگ کا یہ رنگ تھا کہ بھائی! ہمیں کیا چوٹ لگی، جس نے ہمیں مارا ہے، کہیں اس کو ہماری کمر سے تکلیف نہ پہنچ گئی ہو، اس لئے اس مارنے والے کا ہاتھ سہلانے لگے۔ بہر حال، بزرگوں کے یہ مختلف الوان تھے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی دوسرے کے فعل پر تمہیں جو غصہ آیا، اور تمہارے دل میں کدورت پیدا ہوئی، یہ کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اگر اس غصے کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے حد سے تجاوز ہو گیا تو یہ قابل مؤاخذہ ہے، اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ بدلہ ہی نہ لو، بلکہ معاف کردو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہیں اجر بھی ملے گا اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔

اس خیال کو جمنے مت دو

لہٰذا دل میں جو انفعال کی کیفیت اور اثر پیدا ہوا اس پر کچھ مؤاخذہ تو نہیں ہے، لیکن اگر یہ تأثر زیادہ دیر تک دل میں بیٹھ جائے اور جم جائے، تو بالآخر یہ تأثر انسان کو کبھی نہ کبھی گناہ کے اندر مبتلا کر ہی دیتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ ''حسد'' کا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو آپ نے بڑھتا چڑھتا دیکھا، اب آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ تو مجھ سے آگے بڑھ گیا، میں آگے بڑھتا تو اچھا تھا، اس کے پاس پیسہ زیادہ آ گیا، اس کا مکان میرے مکان سے زیادہ بڑا، اس کی گاڑی زیادہ خوبصورت، اس کی شہرت مجھ سے زیادہ ہے، اس کی تعریف کرنے والے مجھ سے زیادہ، اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔ اور اس کے ساتھ غیر اختیاری طور پر دل میں یہ خیال بھی آ گیا کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے۔ اس حد تک بھی یہ عمل حرام نہیں۔

ورنہ یہ خیال گناہ میں مبتلا کر دیگا

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب یہ خیال دل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں کوئی نہ کوئی ایسا فعل سرزد ہو جاتا ہے جو اس شخص کی بدخواہی پر مشتمل ہوتا ہے جس سے وہ حسد کرتا ہے، مثلاً اس کے لئے بددعا کر دی کہ یا اللہ! اس کی یہ دولت چھن جائے، یا کوئی ایسی تدبیر کر لی جس کے نتیجے میں اس کو نقصان پہنچے، یا لوگوں کے سامنے اس کا ذکر اس انداز سے کر دیا جس سے لوگوں کے دلوں میں اس کی بے عزتی ہو، یا کوئی بھی ایسا کام کر لیا جس سے اپنے دل کے اس جذبے کو تسکین

دینا مقصود ہو، تو یہ سب کام بالاتفاق حرام ہیں۔ لہٰذا صرف خیال کا آجانا بذات خود حرام نہیں تھا، لیکن جب وہ خیال دل میں جم گیا اور اس خیال کے مطابق عمل کر لیا تو اب یہ حرام ہو گیا۔

غیر اختیاری خیال کا علاج

لہٰذا یہ غیر اختیاری خیال جو دل میں آیا ہے، چاہے وہ خیال "حسد" کا ہو یا "تکدر" کا ہو یا "غصہ" کا ہو، اس کا بھی علاج کرنا ضروری ہے، کیونکہ اگر تم نے اس غیر اختیاری خیال کا علاج نہیں کیا تو یہ تمہیں مار دے گا، گرادے گا۔ اب اس کا علاج کیا ہے؟ اس کا علاج یہ ہے کہ پہلے اس خیال کو دل سے برا سمجھو کہ جو خیال میرے دل میں آرہا ہے یہ بہت غلط خیال ہے، میرے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہئے۔ مثلاً میرے دل میں یہ جو خیال آرہا ہے کہ فلاں شخص سے یہ نعمت چھن جائے اور مجھے مل جائے، یہ برا خیال ہے۔ یا مثلاً میرے دل میں فلاں کی طرف سے تکدر پیدا ہو رہا ہے کہ فلاں شخص بہت بُرا آدمی ہے، یہ اچھی بات نہیں۔ اور اس وقت اپنے اندر جو عیوب ہیں، ان کا استحضار کرو کہ میرے اندر کیا عیب ہیں؟ اس نے تو غیبت کرتے ہوئے میرے بارے میں ایک کلمہ کہا تھا، حقیقت میں تو میں اس سے زیادہ کا مستحق تھا۔

پہلا علاج - دعا کرنا

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! میرے دل میں جو خیال پیدا ہو رہا ہے، کہیں میرا یہ خیال کسی ایسے فعل پر آمادہ نہ کر دے جو حرام ہو، اور اس

کے نتیجے میں میں ہلاک ہو جاؤں۔ یا اللہ! میرے دل سے اس خیال کو نکال دیجئے۔ اس خیال کا اس طریقے سے علاج کرنا ضروری ہے اور اگر تم اس خیال کا اس طرح سے علاج نہیں کرو گے، بلکہ اس خیال کو اسی طرح چھوڑ دو گے تو وہ خیال دل میں جمتا چلا جائے گا اور کسی نہ کسی وقت وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے گا۔ لہٰذا اس خیال کو برا سمجھو اور اس کو ختم کرنے کی فکر کرو۔ اور اگر دوسرے کی طرف سے حسد پیدا ہو رہا ہے تو ایسی تدبیریں اختیار کرو جو تقاضۂ حسد کے الٹ ہوں۔ مثلاً دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ فلاں شخص ذلیل ہو جائے، لیکن تم دل پر پتھر رکھ کر یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو عزت عطا فرما۔ یا مثلاً دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ لوگ اس کی برائی کریں اور لوگوں کی نظروں میں یہ حقیر ہو جائے، لیکن تم اس کے لئے یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو لوگوں کی نظروں میں مقبول بنا دے۔ دعا کے یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت حاسد کے دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن اس بیماری کا علاج یہ آرے چلانا ہی ہے۔ اسی طرح اگر دوسرے کی طرف سے دل میں تکدر پیدا ہو رہا ہے تو اس کا بھی یہی علاج ہے کہ اپنے اس تکدر کو بُرا سمجھے۔

دوسرا علاج، عذاب کا استحضار

آخر میں حضرت والاؒ نے فرمایا کہ: ”افعال پر عقوبت کا استحضار کیا جائے“ یعنی میرے دل میں جو تکدر پیدا ہو رہا ہے اگر اس تکدر نے آگے بڑھ کر مجھ سے کوئی گناہ کا کام کرا لیا، مثلاً غیبت کرا لی یا دوسرے کی بدخواہی کا کام کرا لیا تو اس گناہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب ہو گا وہ عذاب کتنا سخت ہے۔ یہ عقوبت کا

استحضار کیوں کرے؟ "تاکہ داعیہ افعال کا مضمحل ہو جائے" یعنی دل میں جو یہ خیال آرہا ہے کہ میں اس کے خلاف کوئی کام کر گزروں، یہ خیال کمزور ہو جائے۔

ایک ہفتہ کے بعد اطلاع دو

پھر آخر میں حضرت نے فرمایا کہ "ایک ہفتہ کے بعد پھر اطلاع دی جائے" کیونکہ معالج تو یہ دیکھتا ہے کہ اس دوا سے کتنا فائدہ ہوا، اگر فائدہ ہوا تو ٹھیک، ورنہ بدل کر دوسری دوا دی جائے، اس لئے کہ بعض اوقات پہلے سے زیادہ کڑوی دوا دینی پڑتی ہے، اس لئے صرف ایک مرتبہ شیخ سے رہنمائی لینا کافی نہیں۔ لہٰذا حضرت والاؒ نے جو بیان فرمایا وہ اصول کے درجے میں تو درست ہے، لیکن مختلف حضرات کے لحاظ سے یہ علاج کسی کے لئے کار آمد ہو جائے گا اور دوسرے کے لئے مزید کسی علاج معالجے کی ضرورت ہو گی۔ لہٰذا کوئی شخص یہ اصولی علاج پڑھ کر یہ نہ سمجھے کہ میں نے یہ اصول پڑھ لیا اور علم حاصل ہو گیا، اور اب میں خود ہی اس پر عمل کر لوں گا اور اپنے آپ کو اس گناہ سے بچا لوں گا، شیخ کی ضرورت ہی نہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ شیخ کی پھر بھی ضرورت ہے، اگرچہ تمہیں علم حاصل ہو گیا، لیکن ایک ہفتہ کے بعد شیخ کو اطلاع دینا کہ اس علاج سے کتنا فائدہ ہوا، اس کے بعد شیخ فیصلہ کرے گا کہ یہ علاج کافی ہے یا نہیں؟ اور مزید دوا کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

نویں مجلس

غیبت کی معافی کا طریقہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

نویں مجلس

الحمد للّٰہ رب العالمین ۔ والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ۔

أمّا بعد!

غیبت کی معافی کا طریقہ

حضرت والاؒ نے فرمایا کہ:

"اگر کسی کی غیبت ہوگئی تو استغفار کے ساتھ مغتاب سے بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔ لیکن تفصیل غیبت کی اس کو بتلانا اس کو ایذاء دینا ہے، اس لئے اجمالاً یوں کہنا کہ "میرا کہا سنا معاف کردو"، "کافی ہے"

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵۱)

حضرت والا نے اس ملفوظ میں غیبت کی معافی کا طریقہ بیان فرمایا ہے کہ اگر کسی کی غیبت ہو جائے تو اس کی معافی کا کیا طریقہ ہے؟ غیبت کا تعلق حقوق العباد سے ہے، کیونکہ غیبت میں دوسرے مسلمان بھائی کا حق پامال ہوتا ہے اور

حقوق العباد کی معافی اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے۔ لہٰذا اگر آپ نے کسی کو جسمانی یا ذہنی یا کسی اور قسم کی تکلیف پہنچائی ہے تو محض توبہ استغفار کرلینے سے اس کی معافی نہیں ہوگی بلکہ صاحبِ حق کا معاف کرنا ضروری ہے۔

حقوق العباد کی سنگینی

جو گناہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے شراب نوشی ہے، زناکاری ہے وغیرہ، ان کی معافی کا راستہ یہ ہے کہ اگر انسان ایک مرتبہ بیٹھ کر صدق دل سے یہ عزم کرلے کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا، اور پچھلے گناہ پر نادم اور شرمندہ ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر توبہ کرلے تو انشاء اللہ یہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ لیکن حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کا حق پامال کیا گیا۔ غیبت بھی اسی میں داخل ہے۔ لہٰذا اگر خالی بیٹھ کر توبہ کرلی کہ یا اللہ! جو غیبت کرلی ہے اس سے میں توبہ استغفار کرتا ہوں مجھے معاف فرما، صرف اتنا کرلینے سے غیبت کا گناہ معاف نہیں ہوگا جب تک اس شخص سے معافی نہ مانگی جائے جس کی غیبت لی گئی ہے اور وہ معاف نہ کردے، اس وقت تک غیبت کا گناہ معاف نہیں ہوگا۔ اس لئے حضرت والا نے اس ملفوظ میں فرمایا کہ اگر کسی کی غیبت ہوگئی تو استغفار کے ساتھ "مغتاب" سے (یعنی جس کی غیبت کی گئی تھی اس سے) بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔"

غیبت کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں

پھر فرمایا کہ:

"لیکن تفصیل غیبت کی اس کو بتلانا اس کو ایذاء دینا ہے۔"

مثلاً اس سے یہ کہنا کہ میں نے فلاں وقت میں فلاں غیبت کی تھی اور تمہیں یہ یہ کہا تھا اور تمہاری یہ یہ بُرائی بیان کی تھی، اب تم مجھے معاف کر دو" کیونکہ اندیشہ یہ ہے کہ اس تفصیل کے بیان سے اس کو تکلیف پہنچے گی۔ اس لئے ساری تفصیل بیان کر کے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اجمالاً یوں کہنا کہ میرا کہا سنا معاف کر دو، یہ بھی کافی ہے۔ دیکھئے، اللہ تعالیٰ کتنی آسانی کے راستے پیدا فرما دیتے ہیں۔

کہا سنا معاف کر دینا

یہ جملہ کہ "کہا سنا معاف کر دینا" یہ ہمارے بزرگوں کا چلایا ہوا کتنا حکیمانہ جملہ ہے۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے اس وقت سے بڑوں سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ جب دو چار آدمی کچھ دن ساتھ رہنے کے بعد جدا ہونے لگتے ہیں تو اس وقت ایک دوسرے سے یہ جملہ کہتے ہیں کہ بھائی! ہمارا کہا سنا معاف کر دینا۔ اس لئے کہ جب سفر یا حضر میں دو چار آدمی ساتھ رہتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کی حق تلفی ہونے کا احتمال ہوتا ہے، لہٰذا جدا ہونے سے پہلے ان حقوق کو معاف کرالو، اگر یہ معاف نہ کرایا اور بعد میں کچھ عرصہ کے بعد خیال آیا کہ ہم نے تو فلاں کی حق تلفی کی تھی، تو اس وقت کہاں ڈھونڈتے پھرو گے؟ بعد میں

معلوم نہیں کہ ملاقات ہو یا نہ ہو، معافی مانگنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لہٰذا جدا ہوتے وقت ہی یہ کام کر لینا چاہئے۔ اس جملہ میں غیبت بھی خود بخود داخل ہو جائے گی اور غیبت سے بھی معافی ہو جائے گی۔

حضرت تھانویؒ کا طرزِ عمل

میں نے حضرت ڈاکٹر عبدالحئیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی شخص مجھ سے یہ کہتا ہے کہ میں نے آپ کی غیبت کی ہے، مجھے معاف کر دو۔ تو میں اس سے کہتا ہوں کہ میں معاف تو ضرور کر دوں گا، لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا غیبت کی تھی؟ ظاہر ہے کہ صاحبِ حق کو یہ پوچھنے کا حق ہے کہ کیا غیبت کی تھی۔ فرماتے تھے کہ اس سوال سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات غیبت سچی ہوتی ہے، اس لئے کہ غیبت کے اندر یہ ضروری نہیں ہے کہ غلط ہی ہو تو اس کے بتانے سے اپنی غلطی کا پتہ لگ جاتا ہے۔

کہتی ہے تجھے خلقِ خدا غائبانہ کیا!

دوسرے اس کے ذریعہ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا غیر جانب دارانہ تبصرہ کیا ہے؟

کہتی ہے تجھے خلقِ خدا غائبانہ کیا

کیونکہ جو لوگ تمہارے ارد گرد رہتے ہیں وہ تو تمہاری تعریف ہی کریں

گے، تمہیں اچھا ہی کہیں گے، لیکن پیٹھ پیچھے تمہیں لوگ کیا کہتے ہیں اور تمہارے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں، کیا تصور رکھتے ہیں، اس کا علم ہو جانا بھی مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر سب لوگ تمہاری تعریف کرتے رہیں تو اس کے نتیجے میں بعض اوقات آدمی کے دل میں عجب پیدا ہو جاتا ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ یہ ساری مخلوق جو میری تعریف کر رہی ہے، تو ضرور میرے اندر کمال ہے جس کی وجہ سے یہ ساری مخلوق میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس طرح دل میں عُجب پیدا ہو جاتا ہے۔

اس عُجب کا علاج یہ ہے کہ تم یہ دیکھو کہ جو لوگ تمہارے پیچھے رہنے والے ہیں، وہ تمہیں کیا کہتے ہیں؟ اور تمہارے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ اس کے ذریعہ انسان کے عُجب کا علاج ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب میرے پاس کوئی معافی مانگنے آتا تو میں اس سے کہتا کہ میں معاف تو کر دوں گا، لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا غیبت کی تھی؟ جب بتاؤ گے تو میں معاف کر دوں گا۔

اجمالی معافی تمام متعلّقین سے مانگ لو

اب سوال یہ ہے کہ کس کس سے معافی مانگے؟ پہلے تو دھیان اور فکر نہیں تھی، نہ جانے کس کس کی غیبت ہو گئی، تو کیا ان آدمیوں کی پہلے فہرست بنائے، اور پھر ان سے معافی مانگے؟ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! اگر جنّت لینی ہے تو جنّت اس قدر سستی نہیں ہے، یہ کام تو کرنا پڑے گا۔ لہٰذا جو اپنے متعلّقین ہیں، اپنے دوست احباب ہیں، ملنے جلنے والے ہیں، عزیز رشتہ

دار ہیں، ان کی ایک فہرست بناؤ، اور پھر جا کر ان سے معافی مانگو۔

حضور ﷺ کا صحابہ سے معافی مانگنا

ہم اور آپ تو کس شمار و قطار میں ہیں، ہم سب کے سردار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کے مجمع میں کھڑے ہو کر معافی مانگ رہے ہیں، کہ کسی کا مجھ پر کوئی حق رہ گیا ہو تو وہ یا تو مجھ سے وصول کر لے، اور اگر جسمانی حق ہو تو مجھ سے بدلہ لے لے، یا معاف کر دے۔ چنانچہ ایک صحابی کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے ایک دن میری کمر پر مارا تھا، وہ میرا حق آپ ﷺ کے ذمے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں نے تمہاری کمر پر مارا تھا تو تمہیں حق ہے کہ تم میری کمر پر آکر مار لو۔ جب وہ صحابی قریب آئے تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جس وقت آپ نے میری کمر پر مارا تھا، اس وقت میری کمر پر کپڑا نہیں تھا، جبکہ آپ کی کمر مبارک پر کپڑا ہے۔ چنانچہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے کمر مبارک سے کپڑا اٹھالیا۔ ان صحابیؓ کا اصل مقصد یہ تھا کہ میں مہر نبوت کو بوسہ دوں۔ چنانچہ وہ صحابیؓ آگے بڑھے اور مہر نبوت کو بوسہ دیا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے لئے تیار تھے کہ کوئی چھوٹا بھی مجھ سے آکر بدلہ لینا چاہے تو بدلہ لے لے۔ جب اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں ہو، آخرت کی فکر ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس ہو، تو پھر دنیاوی طور پر لوگوں کے سامنے ذلیل ہونے کے سارے تصورات ہیچ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے نفس و شیطان نے ہمارے دلوں

میں ان تصورات کے بت بنا رکھے ہیں کہ معافی مانگنے سے ہماری ذلت ہو جائے گی، ہماری ناک کٹ جائے گی، ہماری بے عزتی ہو جائے گی۔ ارے ایسی ہزار بے عزتیاں ہو جائیں، اس کے لئے ہم تیار ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ اپنی ناراضگی سے بچالے اور اپنے غضب سے بچالے۔

میرے والد ماجدؒ کا معافی نامہ شائع کرانا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب دل کا دورہ پڑا، اسپتال میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے، جب ہوش آیا تو پہلا کام جو مجھ سے فرمایا، وہ یہ تھا کہ:

> میری طرف سے میرے تمام متعلقین کو ایک تحریر لکھ کر بھیج دو کہ جس کسی کا کوئی حق مجھ سے فوت ہوا ہو، یا کسی کی غیبت کی ہو، یا برائی کی ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے یا مجھے معاف کر دے۔

چنانچہ میں نے وہ تحریر لکھی اور "کچھ تلافیٔ مافات" کے نام سے پہلے "البلاغ" میں شائع کی، اور پھر اس کو ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جتنے متعلقین تھے، ان سب کے پاس بھیجا۔

بہر حال، حقوق العباد کی معافی کیلئے صرف زبانی توبہ کافی نہیں، بلکہ صاحب حق سے معاف کرانا ضروری ہے، اور غیبت کرنا حق العبد کو ضائع کرنا ہے، لہٰذا جس کی غیبت کی ہے اس سے معافی مانگنا ضروری ہے۔

جس کی غیبت کی اس کی تعریف کرو

آگے فرمایا کہ:

> اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کے سامنے غیبت کی تھی ان کے سامنے اس کی مدح و ثنا بھی کرو اور پہلی بات کا غلط ہونا ثابت کردو۔ (ایضاً)

کیونکہ تم نے اس سے تو معافی مانگ لی، اور اللہ تعالیٰ سے بھی توبہ استغفار کر کے معاملہ صاف کرلیا، لیکن مخلوق کے دل میں تم نے اس شخص کی جو برائی پیدا کی ہے اس کی تلافی بھی ضروری ہے، تلافی کے لئے اب اس کی مدح و ثنا اور تعریف کرو، اور پہلی بات کا غلط ہونا ثابت کردو اور ان سے یہ کہو کہ جو بات میں نے کہی تھی وہ غلط تھی۔ آگے فرمایا:

> اور اگر وہ بات غلط نہ ہو، بلکہ سچی ہو تو یوں کہدو کہ بھائی اس بات پر اعتماد کر کے تم فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا، کیونکہ مجھے خود اس پر اعتماد نہیں رہا۔ یہ تو ریہ ہو جائے گا، کیونکہ سچی بات پر بھی اعتماد قطعی بدون وحی کے ہو نہیں سکتا۔ (ایضاً)

یعنی اگر تم نے غیبت کے دوران سچی برائی بیان کر دی تھی، کیونکہ غیبت سچی بھی ہوتی ہے، تو اب اس کے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ غلط تھی، لہٰذا اب یہ کہدو کہ میری اس بات پر اعتماد کر کے تم فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا،

کیونکہ مجھے خود اس بات پر اعتماد نہیں رہا۔ اس لئے کہ کچی بات پر مکمل بھروسہ وحی کے بغیر نہیں ہو سکتا، مکمل بھروسہ کے لئے یا تو مشاہدہ ہو، یا وحی ہو، اس کے علاوہ سوفیصد اعتماد کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اب مجھے اس بات پر اعتماد نہیں۔ انشاء اللہ اس کے ذریعہ اس غیبت کی تلافی ہو جائے گی جو آپ نے اس کی برائی بیان کر کے کی ہے۔

جس کی غیبت کی تھی اگر وہ مر چکا ہو تو

آگے ارشاد فرمایا کہ:

> اگر وہ شخص مر گیا ہو جس کی غیبت کی ہے، تو اب معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے دعا و استغفار کرتے رہو، یہاں تک کہ دل گواہی دیدے کہ اب وہ تم سے راضی ہو گیا ہو گا۔

یعنی جس شخص کی آپ نے غیبت کی تھی، اب اس کا انتقال ہو چکا ہے، تو اب اس سے کیسے معافی مانگی جائے؟ تو اس سے معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے دعاء واستغفار کرتے رہو، یہاں تک کہ تمہارا دل یہ گواہی دیدے کہ اب وہ شخص تم سے راضی ہو گیا ہو گا۔

لہٰذا حقوق العباد کا معاملہ اگرچہ بڑا سنگین ہے کہ جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، اس وقت تک معاف نہیں ہو گا۔ اور اگر صاحبِ حق کا انتقال ہو گیا تو اور زیادہ مشکل، لیکن کسی صورت میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، کسی بھی

حالت میں اللہ تعالیٰ نے مایوسی کا راستہ نہیں رکھا کہ اب تیرے لئے معافی کا راستہ بند ہے۔

ننانوے قتل کرنے والے کا راستہ

بخاری شریف میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے ننانوے قتل کر دیے، پھر اس کو توبہ اور استغفار کا خیال آیا تو وہ ایک راہب کے پاس گیا، اور اس سے جا کر کہا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں، کیا میرے لئے توبہ اور معافی کا کوئی راستہ ہے؟ اس راہب نے کہا کہ تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، تو سیدھا جہنم میں جائے گا، اس لئے کہ تو نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا ہے۔ اور صرف توبہ کرنے سے یہ گناہ معاف نہیں ہوگا۔ جب تک کہ تو ان سب مقتولین کے ورثاء سے معافی نہ مانگ لے، اور ان سب کے ورثاء سے کیسے تو معافی مانگے گا؟ اس لئے تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، تو جہنمی ہے۔ اس نے کہا کہ اچھا میری معافی کا کوئی راستہ نہیں تو ننانوے قتل تو ہو گئے، سوواں ایک اور سہی، اور یہ کہکر اس نے اس راہب کو بھی قتل کر دیا۔ اس طرح اس نے سو کی تعداد پوری کر لی۔

اس کے بعد پھر ایک اور راہب کے پاس گیا، اس سے جا کر اس نے سارا واقعہ بتایا کہ ننانوے تو پہلے قتل کر دیے تھے، ایک اور قتل کر دیا، اب بتائیے کہ میرے لئے توبہ اور استغفار کا کوئی راستہ ہے؟ اس راہب نے کہا کہ ہاں! تیرے لئے توبہ کا راستہ ہے، وہ یہ کہ تو پہلے توبہ اور استغفار کر، اور پھر فلاں مقام پر ایک بستی ہے، وہاں نیک لوگ رہتے ہیں، وہاں جا کر ان کی صحبت اختیار کر۔ اس راہب

نے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کا مشورہ اس لئے دیا تھا کہ جب برے لوگوں کی صحبت سے نکل کر نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرے گا تو اس گناہ سے بچنا اس کے لئے آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ قاتل توبہ اور استغفار کر کے یہ ارادہ کر کے اپنی بستی سے چل پڑا کہ میں اب اپنی زندگی میں انقلاب لاؤں گا اور آئندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کروں گا، کوئی نافرمانی نہیں کروں گا، نیک لوگوں کی صحبت اختیار کروں گا، جو میرے ذمے فرائض و واجبات ہیں ان کو ادا کروں گا۔ یہ سب ارادے لے کر چلا۔

ابھی وہ راستے میں تھا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آگیا کہ اس کی روح قبض کرلو، چنانچہ اس کی روح قبض کرلی گئی اور اس کا انتقال ہو گیا، اب انتقال کے بعد ملائکہ کا آپس میں جھگڑا ہو گیا، ملائکہ رحمت نے کہا کہ یہ شخص توبہ کر کے پاک صاف ہو کر دوسری بستی کی طرف جا رہا تھا، اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے جا رہا تھا، لہٰذا ہم اس کو لے کر جائیں گے۔ جو ملائکہ عذاب تھے، انہوں نے کہا کہ اس شخص کی ساری زندگی گناہوں کے اندر گزری، اس نے سو آدمیوں کو قتل کیا ہے، لہٰذا ہم اس کو عذاب کے لئے لے جائیں گے۔ یہ جھگڑا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا یہ دیکھو کہ جس بستی سے یہ نکلا تھا اور جس بستی کی طرف یہ جا رہا تھا، انتقال کے وقت یہ کس بستی سے زیادہ قریب تھا؟ جب ناپا گیا تو جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس سے چند گز زیادہ قریب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب یہ شخص توبہ کر کے نیک لوگوں کی بستی کی طرف چل پڑا تھا اور اس سے زیادہ قریب ہو گیا تھا تو اب ہم بھی اس کے ساتھ مغفرت کا معاملہ کرتے ہیں۔

مایوس ہونے کی ضرورت نہیں

بہر حال، مایوسی کا کوئی راستہ نہیں کہ چونکہ ہم سے حقوق العباد ضائع ہوگئے ہیں، اور جن کے حقوق ضائع کئے ہیں ان کا انتقال ہو گیا ہے، لہٰذا اب ہماری مغفرت نہیں ہو سکتی، ایسا نہیں ہے۔ ابتداء میں تو حقوق العباد کا بہت اہتمام کرو، اور ان کے ضائع ہونے کو سنگین سمجھو، اور کسی اللہ کے بندے کے حق کو پامال نہ کرو، لیکن اگر کسی کا کوئی حق ضائع ہو جائے تو فوراً معاف کرالو اور اگر معاف کرانے کا کوئی راستہ نہ ہو تو مایوس نہ ہو، بلکہ اس کے لئے استغفار کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو کہ یا اللہ! اپنے فضل و کرم سے مجھ سے ان بندوں کو راضی کر دیجئے جن کے حقوق میں نے پامال کئے، اور یہ دعا کرتے رہو کہ یا اللہ! ان کے درجات بلند فرمایئے، ان کی مغفرت فرمایئے، ان کو رضاء کاملہ عطا فرمایئے۔ یہ دعا کرتے رہو یہاں تک کہ یہ گمانِ غالب ہو جائے کہ وہ راضی ہوگئے ہونگے۔

ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں مایوسی کا کوئی راستہ نہیں، ساری تعلیم یہ ہے کہ:۔

سوئے ناامیدی مرو امید ہا است

سوئے تاریکی مرو خورشید ہا است

حضرت والا ناامیدی اور تاریکی کی طرف جانے ہی نہیں دیتے، بلکہ راستہ بتا دیتے ہیں کہ اب اس طرح کرلو، اب اس طرح کرلو، اللہ تعالیٰ نے ہر صورت حال کا علاج رکھا ہے۔

کفر و شرک سے توبہ

دیکھئے! کفر و شرک سے زیادہ خراب چیز دنیا میں کوئی اور نہیں، کفر اور شرک کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو معاف نہیں کروں گا، اس کے علاوہ ہر چیز معاف کردوں گا۔ لیکن اس کفر و شرک سے بھی توبہ کرنے کا راستہ کھول دیا، اگر ستر برس کا کافر بھی کفر و شرک سے توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ قبول کرلیتے ہیں اور اس کو معاف فرمادیتے ہیں۔

شیطان کا بہکاوا

لہٰذا حقوق العباد کا معاملہ اگرچہ مشکل ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی ناامید ہو کر بیٹھ جائے۔ **اسی** لئے شیطان انسان کے اندر مایوسی پیدا کرکے بہکاتا ہے اور وہ انسان سے یہ کہتا ہے کہ اس گناہ کے نتیجے میں تو مردود ہوگیا، اب تیرا ٹھکانہ جہنم ہے، تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، لہٰذا جو تیری مرضی میں آئے وہ کام کر، اس لئے کہ جب جہنم میں جانا ہی ٹھہرا تو پھر دنیا میں خوب مزے اڑا کر اور خوب گناہ کرکے جا۔ یہ شیطان اس طرح دھوکہ دیتا ہے اور زیادہ گناہوں کے اندر مبتلا کردیتا ہے۔

جب کہ حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی مؤمن کا کام نہیں، کتنے ہی بڑے سے بڑے گناہ کرلئے ہوں پھر بھی وہ گناہ اللہ کی رحمت سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔

"ابونواس" کی مغفرت کا واقعہ

عرب کے ایک شاعر گزرے ہیں، جس کی کنیت "ابونواس" تھی، یہ آزاد منش قسم کا شاعر تھا، ان شعراء میں اس کا شمار تھا جو ہر قسم کے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں، چنانچہ ساری عمر گناہوں میں اور پینے پلانے میں گزری۔ ایک شخص نے مرنے کے بعد ان کو خواب میں دیکھا، اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ اس نے کہا کہ میں کیا بتاؤں! جب میں مر رہا تھا، اس وقت میں بہت ڈر رہا تھا کہ جب اللہ میاں کے سامنے جاؤں گا تو وہاں میری ایسی پٹائی ہوگی کہ ساری زندگی کے مزے دھرے رہ جائیں گے، اس لئے مجھے بہت فکر اور تشویش تھی کہ کیا ہوگا؟ اسی فکر اور تشویش کے عالم میں میں نے تین شعر کہے، بس اللہ تعالیٰ نے ان شعروں کی وجہ سے مجھے بخش دیا۔ اب خواب میں اس نے وہ شعر سنائے کہ وہ شعر یہ تھے، وہ شعر بھی بڑے عجیب تھے، جب اللہ تعالیٰ شاعر کو توفیق دیدے تو شعر کے اندر اچھی بات بھی خوب بیان کرتا ہے۔ وہ شعر یہ ہیں۔

یَاربّ ان عَظُمَتْ ذنوبی کثرۃً
فلقد عَلمتُ بأنّ عفوك اَعْظمُ
ان کان لا یر جوك الاَّ محسنٌ
فَبِمن یلوذ ویستجیر المجرمُ

اے پروردگار! اگرچہ میرے گناہ بہت زیادہ ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کی مغفرت اور آپ کی معاف کرنے کی صفت میرے گناہوں سے کہیں

زیادہ عظیم ہے۔ اگر آپ کی رحمت کی امید صرف نیک لوگ ہی کر سکتے ہیں تو یہ مجرم بیچارہ کہاں جائے گا؟ یہ کس کی پناہ حاصل کرے گا؟ یہ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔

وَمَدَدتُ یَدِی إِلَیکَ تَضَرُّعاً
فَلَئِن رَدَدتَ یَدِی فَمَن ذَا یَرحَمُ

میں آج آپ کے سامنے عاجزی کے ساتھ ہاتھ پھیلا رہا ہوں، اگر آپ نے یہ ہاتھ واپس کر دیے تو پھر کون ہے جو ان پر رحم کرے۔

جاتے جاتے یہ شعر کہے، پتہ نہیں کس دل سے یہ اشعار کہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جا، میں تیری ان شعروں پر بخشش کرتا ہوں۔ اور یہ وہ اشعار ہیں جو "ابونواس" کے بیاض میں موجود نہیں تھے، اس لئے کہ بالکل آخر وقت میں دنیا سے جاتے جاتے کہے تھے، اس لئے بیاض میں لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی، اس لئے خواب ہی میں خواب دیکھنے والے کو بتایا کہ میں نے یہ شعر کہے تھے۔ جس شخص نے خواب دیکھا تھا، اس نے اس خواب ہی کے حوالے سے یہ اشعار ابونواس کے دیوان میں تحریر کر دیے۔

ظاہری حالت پر فیصلہ مت کرو

اسی لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی ظاہری حالت دیکھ کر اس کے بارے میں کبھی جنتی یا جہنمی ہونیکا فیصلہ نہ کرو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی کونسی ادا پسند آجائے، کیا پتہ آخر میں اس کا خاتمہ کیسے عمل پر ہو، اور اللہ تعالیٰ اس

کو نواز دے، اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "میں ہر مسلمان کو اپنے آپ سے حالاً اور ہر کافر کو احتمالاً افضل سمجھتا ہوں۔ "احتمالاً" کا مطلب یہ ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق دیدے اور مجھ سے آگے نکل جائے۔ اس لئے ظاہری حالت میں کوئی شخص کیسا بھی ہو، تم اس کے فعل سے نفرت کرو کہ یہ شراب پینا بری بات ہے، لیکن اس کی ذات سے نفرت مت کرو۔ کیا پتہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دیدے اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر صحیح طور پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

دسویں مجلس
غیبت مباح کی صورت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔لیاقت آباد، کراچی ۱۹

دسویں مجلس

﴿گزشتہ سے پیوستہ﴾

الحمد للّٰہ رب العالمین۔ والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم۔ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

أمّا بعد!

غیبت مباح کی صورت

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ:

اگر دینی ضرورت ہو تو پھر غیبت بھی مباح ہے، جیسے محدّثین نے رواۃ حدیث پر جرح کی ہے۔ اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی غیبت محرمہ ہے اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے۔ کِذب کا مدار تحقیق کذب پر نہیں بلکہ عدم تحقیق صدق پر ہے۔

یعنی دینی ضرورت سے کسی کا عیب یا برائی بیان کرنا جائز ہے۔ چنانچہ تمام محدّثین حضرات کا تو کام ہی لوگوں کے حالات کی تحقیق کرنا تھی کہ فلاں راوی کیسا ہے اور فلاں راوی کیسا ہے؟ چنانچہ جب کوئی شخص ان سے راوی کے بارے میں سوال کرتا تو وہ بتا دیتے کہ یہ راوی ضعیف ہے، اور یہ راوی جھوٹا ہے، یہ راوی کذّاب ہے، یہ راوی شتام ہے۔ لیکن یہ بیان کرنا ان کے ذمے واجب تھا۔ اگر بیان نہ کرتے تو گناہ گار ہوتے، کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی حفاظت کا یہی طریقہ تھا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ کونسا راوی کیسا ہے؟ لہٰذا یہ غیبت چونکہ دینی ضرورت کے لئے تھی اس لئے یہ جائز تھی۔

علی بن مدینیؒ کا واقعہ

حضرت علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے محدّثین میں سے ہیں اور جرح و تعدیل کے امام ہیں۔ البتہ ان کے والد حدیث کے معاملے میں پوری طرح قابل اعتماد نہیں تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اپنے والد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ حدیث میں قوی ہیں یا ضعیف ہیں؟ پہلے تو فرمایا کہ میرے والد کے بارے میں یہ بات دوسرے محدّثین سے پوچھ لو۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ ان کے بارے میں مجھے آپ کی رائے معلوم کرنی ہے۔ جب سوال کرنے والے نے اصرار کیا تو آپ نے سر جھکایا اور پھر فرمایا: هو الدين، انه ضعيف" یہ دین کی بات ہے، اس لئے یہ بتا رہا ہوں کہ میرے والد حدیث کے معاملے میں ضعیف ہیں۔ چونکہ دین کی بات ہے اور دین کی بات کو چھپانا نہیں ہے، چاہے وہ باپ کے خلاف ہو یا بیٹے کے خلاف ہو، وہ دین کی ضرورت کے

تحت کہنی ہوگی۔

امام ابوداوُدؒ کا واقعہ

امام ابوداوُد بجستانی رحمۃ اللہ علیہ جو "سنن ابوداوُد" کے مصنف ہیں، اتنے بڑے جلیل القدر محدّث اور اتنے بڑے امام ہیں۔ ان کا بیٹا "ابن أبی داوُد" حدیث کے بارے میں ضعیف تھا۔ امام ابوداوُدؒ سے کسی نے پوچھا کہ اپنے بیٹے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا:

لا تحلّ عنه الرواية

اس سے روایت کرنا حلال نہیں

دیکھئے! حضرات محدّثین نے عیب کا اظہار کرنے میں نہ باپ کی پرواہ کی، نہ بیٹے کی پرواہ کی، اور نہ عزیز واقارب کی پرواہ کی، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا معاملہ تھا اور راوی کی خامی کا اظہار کرنا دینی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ محدّثین کا گروہ پیدا ہی اسی مقصد کے لئے کیا تھا کہ ان کے ذریعہ احادیث کی حفاظت کا کام کرایا جائے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جہاں دین کی ضرورت ہو، وہاں نہ صرف یہ کہ غیبت کرنا جائز ہے بلکہ بعض اوقات غیبت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ورنہ غیبت محرمہ ہے

"لیکن اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی

غیبت محرمہ ہے"

اب یہ فرق کرنا ہے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں، یہ واقعی دینی ضرورت سے کہہ رہا ہوں یا اپنے نفس کی لذت لینے کے لئے نفسانیت کے طور پر کہہ رہا ہوں، جائزہ لینے پر پتہ چلے گا کہ غیبت کے شوق میں اب نفس نے یہ حیلہ تراش لیا کہ جو بات تم کہہ رہے ہو یہ دینی ضرورت کے تحت کہہ رہے ہو۔ لیکن جب اپنے باطن کے اندر کرید کر دیکھو گے تو پتہ چلے گا کہ حقیقت میں دینی ضرورت نہیں تھی بلکہ نفسانیت تھی، لہٰذا وہ غیبت محرمہ ہے، چاہے وہ ایسی بات ہو جو حقیقت میں صحیح اور درست ہو اور تحقیق سے ثابت ہو چکی ہو، تب بھی وہ حرام اور ناجائز ہے۔

بلا تحقیق بات کہنا بہتان ہے

"اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے۔ کذب کا مدار تحقیق کذب پر نہیں بلکہ عدم تحقیق صدق پر ہے۔"

یعنی جھوٹ کا مدار صرف اس بات پر نہیں کہ جب کسی چیز کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے تب جھوٹ ہو گا، بلکہ اگر کسی چیز کا سچا ہونا ثابت نہیں ہوا پھر بھی تم اس کو بیان کر رہے ہو تو تمہارے حق میں وہ کذب ہے، کیونکہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف ارشاد فرمادیا:

كفى بالمرء كذباً أن يحدث بكل ما سمع

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی التشدید فی الکذب)

انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو آگے بیان کر دے۔

لہٰذا جب ہم دوسرے کی غیبت کرتے ہیں تو شیطان آکر یہ سبق پڑھاتا ہے کہ تم جو برائی بیان کر رہے ہو، یہ کوئی گناہ کا کام نہیں ہے کیونکہ یہ دینی ضرورت ہے، حالانکہ حقیقت میں وہاں کوئی دینی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اپنی نفسانیت ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، ایک محقق اور شیخ ہی اس کا فرق بتاتا ہے کہ یہ جو کام کیا ہے یہ دینی ضرورت سے کیا ہے یا نفسانیت کی وجہ سے کیا ہے۔ شیطان دینی ضرورت کو آڑ بنا کر غیبت میں مبتلا کرا دیتا ہے، یہ غیبت کھلی ہوئی غیبت سے زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتا ہے کہ یا اللہ! میں جو غیبت کر رہا ہوں، تیرے دین کی ضرورت سے کر رہا ہوں، لہٰذا اس میں غیبت کے گناہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا گناہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے غیبت کے گناہ سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

غیبت سے حسّی تکلیف ہوتی ہے

حضرت والا نے فرمایا کہ:

"غیبت میں نہ معلوم لوگوں کو کیا مزا آتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے اپنا جی خوش کر لیتے ہیں، پھر اگر اس کو خبر ہو گئی اور اس سے دشمنی پڑ گئی تو عمر بھر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، اور اگر ذرا دل میں حس ہو تو غیبت کرنے کے

ساتھ ہی قلب میں ایسی ظلمت پیدا ہوتی ہے جس سے سخت
تکلیف ہوتی ہے جیسے کسی نے گلا گھونٹ دیا ہو۔

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۲)

چونکہ ہم لوگوں کے مزاج خراب ہو گئے ہیں اور حس جاتی رہی ہے، اس لئے ہم گناہ کرتے رہتے ہیں لیکن ہمیں گناہوں کی ظلمت کا احساس نہیں ہوتا، جن لوگوں کے قلوب کو اللہ تعالیٰ مجلّٰی اور مصفّٰی فرماتے ہیں ان کے قلب پر معمولی سے گناہ کی بھی ایسی ظلمت ہوتی ہے جیسے کسی نے ان پر پہاڑ رکھ دیا ہو۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

اگر دل کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے تو سالک کے
دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا واقعہ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک مرتبہ آپ بہت غمگین بیٹھے ہوئے تھے، اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ گیا ہو۔ ایک شاگرد نے حضرت سے جا کر پوچھا کہ حضرت! آپ کے چہرے پر غم کے آثار نظر آرہے ہیں، خیریت تو ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں کچھ غم ہے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ حضرت! کیا غم ہے؟ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں

دستار بندی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ فرمایا کہ جلسہ میں کچھ ایسی مصروفیت ہو گئی کہ آج جب ہم مسجد میں نماز پڑھنے گئے تو ہماری تکبیر اولیٰ چھوٹ گئی' امام سے نہیں سُن سکے۔ پھر فرمایا کہ ۴۵ سال میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ نماز میں تکبیرِ اولیٰ چھوٹ گئی۔ اب آپ اندازہ لگائیں، کیونکہ صرف تکبیرِ اولیٰ چھوٹ جانے کا مطلب یہ ہے کہ قرأت سنی، رکوع میں شریک ہوئے، رکعت مل گئی، اور صحیح قول کے مطابق تکبیر اولیٰ میں بھی شرکت ہو گئی، لیکن اس کے باوجود تکبیرِ اولیٰ کے چھوٹنے پر اتنے غمگین تھے۔

ہماری بے حِسی

دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ ہماری جماعتیں نکل جاتی ہیں، اور اکثر نمازی حضرات مسبوق ہو کر اپنی نمازیں پوری کرتے ہیں، لیکن اس کا احساس نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے اندر بے حِسی ہے۔ العیاذ باللہ! اللہ تعالیٰ اپنی رحمت فرما کر اسے دور فرمادے۔ آمین۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کا واقعہ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک مشکوک لقمہ پیٹ میں چلا گیا، اس لقمہ کے حلال اور حرام ہونے میں شک تھا، فرمایا کہ ایک مہینے تک اس لقمہ کی ظلمت اپنے دل کے اندر محسوس کرتا رہا۔ ہماری تو حِس خراب ہے، مزاج بگڑا ہوا ہے، اس لئے گناہ کی برائی کا احساس ہی نہیں ہوتا، بس ایسا سمجھتے ہیں جیسے ایک مکھی آکر بیٹھی اور اسکو اڑا دیا،

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہماری حِس کو درست فرمائے اور مزاج درست فرمائے۔ آمین۔

غیبت سے کیا حاصل ہوا؟

بہر حال، غیبت کو چھوڑنے کے لئے یہ سوچنا چاہئے کہ اگر تم نے بڑا بہت وقت غیبت کے اندر خرچ کر بھی لیا اور غیبت سے تھوڑا مزہ بھی آگیا، لیکن اس غیبت کا حاصل کیا ہوا؟ نتیجہ کیا ہوا؟ کیا فائدہ حاصل ہوا؟ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اس کے نتیجے میں آخرت کا اتنا بڑا گناہ کمالیا۔ اور دنیا کے اندر یہ صورت حال ہے کہ اگر اس شخص کو خبر ہوگئی جس کی تم نے غیبت کی ہے کہ فلاں نے میری یہ غیبت کی ہے تو اس کی طبیعت میں تمہاری طرف سے جو کدورت اور عداوت پیدا ہوگی وہ نہ جانے کیا خمیازہ لے کر آئے گی۔

غیبت کے نتیجے میں کئی گناہ ہو جاتے ہیں

اور حقوق العباد کے گناہوں کا قاعدہ یہ ہے کہ جب آدمی ایک گناہ کرتا ہے تو اس کی بیچ میں اس کو دس غلط کام کرنے پڑتے ہیں، مثلاً جس کی غیبت کی تھی اس کو پتہ چل گیا، اس نے آکر اس سے پوچھ لیا کہ تم نے یہ غلط بات کہی تھی؟ اب یا تو اعتراف کرے کہ ہاں! میں نے یہ بات کہی تھی، اب اگر اعتراف کرے تو مجرم بنے، یا اعتراف نہ کرے تو پھر یا تو تاویل کرے گا کہ میں نے تو یوں کہا تھا، یا جھوٹ بولے گا کہ میں نے تو یہ بات نہیں کہی۔ اب اگر اس دوسرے شخص کو پتہ چل گیا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے تو اس کے دل میں اس کی طرف سے اور زیادہ

کدورت اور دشمنی پیدا ہو گی۔ لہٰذا انسان ایسا کام کیوں کرے جس کے نتیجے میں دشمنیاں پیدا ہوں، بغض اور عداوت پیدا ہو، ایسے کام کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ قلب میں ظلمت پیدا ہونے کا نقصان علیحدہ ہے۔

غیبت کا اصل علاج تواضع ہے

حضرت والا نے فرمایا کہ:

غیبت کا علاج بھی تواضع ہی ہے، مگر تواضع ایک دن میں پیدا نہیں ہوتی، اس لئے جب تک تواضع حاصل نہ ہو، غیبت سے بچنے کے لئے فوری علاج یہ کرو کہ بدون سوچے کوئی بات نہ کیا کرو، جو بات کرو سوچ کر کرو، اس سے غیبت کم ہو جائے گی، اور کچھ دنوں کے بعد بالکل نہ ہو گی، اور اگر کسی وقت بے سوچے کوئی بات نکل جائے تو اسی وقت دو رکعت نفل ''صلوٰۃ التوبہ'' کی نیت سے پڑھ لیا کرو۔

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۲)

اس ملفوظ میں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ غیبت انسان سے سرزد ہی نہ ہو، اس کا اصل علاج یہ ہے کہ دل میں تواضع پیدا کرو۔ ہمیشہ یاد رکھو! غیبت تواضع کے فقدان کی وجہ سے ہوتی ہے، جب آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور تکبر میں مبتلا ہوتا ہے، تب دوسرے کی غیبت کرتا ہے۔ جس شخص کو اپنے عیوب کا دھیان ہو، اس کی اصلاح کی فکر ہو، اس کو دوسروں کے عیوب بیان کرنے کی کہاں فرصت، وہ تو اپنے درد میں مبتلا ہے کہ میرے اندر یہ عیب ہے، میرے اندر یہ

خرابی ہے، کس طرح ان کو دور کروں، بس اسی ادھیڑ بُن میں مبتلا ہے، وہ دوسروں کے عیوب کو کہاں دیکھتا پھرے گا۔ ہاں! اگر دل میں تکبر اور بڑائی ہے اور دوسروں کی تحقیر ہے، اس کو اپنی فکر تو نہیں ہے، اس لئے وہ دوسروں کے عیوب کو دیکھتا پھرتا ہے کہ اس میں فلاں برائی ہے، اس میں فلاں برائی ہے، پھر ان برائیوں کو دوسروں کے سامنے بیان کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا غیبت کی اصل جڑ عجب اور تکبر ہے، جب یہ تکبر اور عجب ختم ہو جائے گا تو پھر غیبت کبھی سرزد ہی نہیں ہو گی۔ اس لئے غیبت کا اصل علاج تکبر کا ختم کرنا اور تواضع کا پیدا کرنا ہے۔

ہمارے بزرگوں کی تواضع

حضرت ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دارالعلوم میں تشریف لائے۔ ان کی زبانی ایک واقعہ سنا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ خیر المدارس ملتان کے بانی) نے فرمایا کہ جب میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں جاتا تو بلا مبالغہ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مجلس کے اندر جتنے لوگ موجود ہیں، ان میں سب سے کمتر اور حقیر اور بدحال میں ہوں، اور یہ سب مجھ سے افضل ہیں، بلکہ یہ سب انسان ہیں اور میں بیل ہوں۔ پھر مجھے خیال پیدا ہوا کہ میری یہ حالت درست ہے یا نہیں؟ چنانچہ میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی) کی خدمت میں حاضر ہوا، اور جا کر عرض کیا کہ میرا یہ معاملہ ہے کہ جب میں حضرت والا کی مجلس میں آتا ہوں کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مجلس میں سب سے کمتر اور حقیر میں ہوں، مجھ سے زیادہ حقیر اور کمتر کوئی اور نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب

فرمانے لگے کہ یہ حالت تو میری بھی ہے کہ جب میں مجلس میں جاتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ سب حاضرین سے زیادہ کمتر اور بدحال میں ہی ہوں تو حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ نے فرمایا کہ تم بھی میرے ساتھ اس حال میں شریک ہوگئے، چلیں حضرت والا سے اپنی یہ حالت بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ یہ دونوں حضرات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ جب ہم مجلس میں بیٹھتے ہیں تو ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس مجلس کے اندر جتنے حاضرین ہیں وہ سب ہم سے افضل ہیں اور ہم سب سے کمتر اور ذلیل ہیں اور حقیر ہیں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ کچھ فکر نہ کرو، ارے بھائی! میرا بھی یہی حال ہے، جب میں مجلس میں بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں ان سب کے مقابلے میں کمتر ہوں، سب مجھ سے افضل ہیں۔

غیبت کو ختم کرنے والی چیز تواضع

تواضع یہ نہیں ہے کہ آدمی صرف اپنی زبان سے یہ کہدے کہ احقر ناکارہ ہے، ناچیز ہے، بلکہ تواضع یہ ہے کہ واقعۃً اپنے عیوب پر اتنی نگاہ ہو کہ اپنے عیوب کے مقابلے میں دوسروں کے عیوب نظر ہی نہ آئیں۔ جس دن یہ تواضع پیدا ہوگئی تو پھر انشاء اللہ غیبت پاس بھی نہیں پھٹکے گی۔ اس لئے کہ جب انسان اپنے کو دوسروں سے کمتر سمجھ رہا ہے اور اس کو اپنے عیوب کا استحضار ہے تو وہ دوسروں کے عیوب کو کیسے دیکھے گا؟ لہٰذا اگر "غیبت" کا جڑ سے بالکلیہ خاتمہ کرنا ہے تو اپنے اندر تواضع پیدا کرو۔

اپنے عیوب کا استحضار کرو

اب تواضع کیسے پیدا کریں؟ تواضع پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کا استحضار کرو۔ یہ جو ہر وقت اپنی بڑائی کا خیال دل میں جما رہتا ہے کہ "ہم چوں ما دیگرے نیست" (ہم جیسا کوئی دوسرا نہیں) اور یہ جو ہمیں کبھی اپنے علم پر گھمنڈ، کبھی اپنے تقویٰ پر گھمنڈ، کبھی اپنے مال و دولت پر گھمنڈ، کبھی اپنی صحت پر گھمنڈ، کبھی اپنی شکل و صورت پر گھمنڈ رہتا ہے، یہ گھمنڈ ہی انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔

انسان کی حقیقت یہ ہے

ایک بزرگ سے ایک نوجوان نے کہا کہ جانتے نہیں، میں کون ہوں؟ ان بزرگ نے فرمایا: ہاں! میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو، کہو تو بتادوں؟ چنانچہ ان بزرگ نے فرمایا:

أولك نطفة قذرة ـ وآخرك جيفة قذرة وأنت فيما بين ذلك تحمل العذرة ـ

تیرا آغاز تو یہ ہے کہ تو ایک گندے نطفے سے پیدا ہوا ہے، اور تیرا انجام یہ ہے کہ تو بدبودار مردار ہو جائے گا حتیٰ کہ تیرے گھر والے بھی تجھے رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ اور ولادت سے وفات تک جو درمیان کا عرصہ ہے، اس میں تو گندگی کے ٹوکرے اٹھائے پھر رہا ہے۔

جو کھال جسم پر ہے، اس کھال کو اللہ تعالیٰ نے "ساتر العیوب" بنا رکھا ہے، اگر یہ کھال ذرا سی چھل جائے تو اندر نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے، کہیں خون ہے، کہیں پیپ ہے، کہیں پیشاب ہے، کہیں پاخانہ ہے، یہ سب نجاستیں اٹھائے پھر رہا ہے، یہ حقیقت ہے ہماری، مگر خود کو بڑا سمجھ رہا ہے، اور تکبر کے یہ خیالات پھر انسان کو غیبت پر آمادہ کرتے ہیں۔

لہٰذا "غیبت" کا اصل علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرے، جب تواضع پیدا ہو جائے گی تو پھر انشاء اللہ کسی کی غیبت نہیں ہو گی۔ البتہ جہاں دینی ضرورت ہو وہاں "غیبت" جائز ہے، مثلاً کسی کو نقصان سے بچانا ہے، آپ اس کو بتا دیں کہ فلاں شخص سے ہوشیار رہنا، یہ معاملات کا صاف نہیں ہے، تو یہ غیبت میں داخل ہی نہیں۔

تواضع کیلئے صحبت شیخ

تجربہ یہ ہے کہ رگڑے کھائے بغیر "تواضع" پیدا نہیں ہوتی۔ دراصل بات یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں خنّاس ہوتا ہے، اور وہ خنّاس یہ ہے کہ انسان اپنی رائے کو بالا سمجھتا ہے، اپنی سوچ کو بالکل صحیح سمجھتا ہے کہ جو میں سوچ رہا ہوں یہ صحیح ہے اور دوسرا جو سوچ رہا ہے وہ غلط ہے، جب انسان اپنی اس سوچ اور فکر کو کہیں جا کر اس طرح فنا نہیں کرے گا کہ جو میں سوچتا ہوں وہ غلط ہے اور جو آپ کہتے ہیں وہ صحیح ہے، چاہے مجھے آپ کی سوچ کتنی ہی غلط اور بری معلوم ہو رہی ہو اور دلیل کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، بداہت کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، لیکن

میں آپ ہی کی بات مانوں گا۔ جب تک اس طرح اپنی سوچ و فکر کو نہیں مٹائے گا، اس وقت تک تواضع پیدا نہیں ہوگی اور تکبر ختم نہیں ہوگا۔

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی نصیحت

اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ جب میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے بہت مفصل خط مجھے اور بھائی صاحب حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہم کو لکھا، اس خط میں بہت ساری نصیحتیں فرمائیں، لیکن ایک نصیحت یہ فرمائی کہ:

"میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ صاحبزادگی کا سور بہت دیر سے نکلتا ہے"

یعنی کسی بڑے آدمی کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دماغ میں ایک خنّاس پیدا ہو جاتا ہے، اس کو "سور" سے تعبیر فرمایا، اس خنّاس کا مطلب "تکبر" ہے اور یہ "سور" بہت دیر میں نکلتا ہے، یعنی دوسرے امراض کا علاج تو جلدی ہو جاتا ہے لیکن اس کا علاج بہت دیر سے ہوتا ہے۔ بہرحال، اس خط کے ذریعہ اس طرف ہمیں متوجہ فرمایا کہ اس کی فکر کرنی چاہئے کہ کسی طرح یہ مرض نکل جائے۔ اور پھر فرمایا کہ:

جب کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کے سامنے فنا کر دے اور رگڑے کھائے، جب یہ نکلے، جب تک یہ نہ نکلے اس وقت

تک راستہ نہیں کھلتا۔

علم کا "سور" دیر سے نکلتا ہے

اسی طرح "علم کا سور" ہے کہ ہم عالم ہیں، یہ عالم ہونے کا جو گھمنڈ ہے، یہ بھی بڑا خطرناک ہے اور یہ بھی دیر سے نکلتا ہے۔ جب تک اپنے آپ کو دوسرے کے سامنے فنا نہ کر دے، اس وقت تک یہ نہیں نکلتا۔ اور اگر یہ دونوں جمع ہو جائیں کہ عِلم بھی ہو اور صاحبزادگی بھی ہو، پھر تو سور در سور جمع ہو گئے۔

اس کا علاج آسان نہیں ہے، اس کا علاج صرف یہی ہے کہ کہیں رگڑے کھائے، اپنے آپ کو پامال کرے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قال را بگزار صاحبِ حال شو
پیشِ مردے کاملے پامال شو

"پامال" کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں پاؤں سے روندا جائے۔ پاؤں سے روندے جانے کا مطلب یہ ہے کہ چاہے تمہارے دل و دماغ میں بات نہیں آرہی ہے، عقل اور بداھت کے خلاف وہ بات معلوم ہو رہی ہے، لیکن پھر بھی بڑے کی بات کے سامنے تم اپنے آپ کو اس طرح جھکا دو جیسے پاؤں میں روندا جا رہا ہے۔ جب تک اس پر عمل نہیں ہوگا، اس وقت تک یہ سور دماغ سے نہیں نکلے گا۔ لہٰذا جب تک تکبر دل میں موجود رہے گا، "حسد" بھی رہے گا، غیبت بھی رہے گی، بغض بھی رہے گا، غصّہ بھی رہے گا، اور جب تکبر چلا جائے گا اور تواضع پیدا ہو

جائے گی، اس وقت یہ سارے امراض بھی چلے جائیں گے۔

غیبت ہونے پر جرمانہ

لیکن یہ تواضع اور انکساری ایک دو دن میں پیدا نہیں ہوگی، اس کے لئے محنت اور مشق کی ضرورت ہے، اور کسی شیخ کامل کی صحبت کی ضرورت ہے، تب جاکر تواضع پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب تک یہ بات حاصل نہ ہو یعنی تواضع نہ ہو اس وقت تک یہ کرے کہ بے سوچے بات نہ کرے، اور اگر کبھی غیبت ہو جائے تو اپنے اوپر جرمانہ مقرر کرے۔ ایک جرمانہ کا بیان پیچھے گزر چکا کہ ایک وقت کا فاقہ کرے، یہاں ایک دوسرا جرمانہ بیان فرمایا کہ دو رکعت صلوٰۃ التوبہ پڑھ لیا کرو۔ اس طرح کرنے سے رفتہ رفتہ انشاء اللہ یہ بیماری دور ہو جائے گی۔

صرف آرزو کرنا کافی نہیں

دیکھئے! دنیا میں کوئی کام محنت کے بغیر نہیں ہوتا، تھوڑی بہت محنت ضرور کرنی پڑتی ہے، محض آرزو کر لینے سے اور خواہش کر لینے سے کام نہیں بنتا ہے۔

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

یعنی صرف آرزو کر لینے سے تقدیر نہیں بدلا کرتی بلکہ اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔

ایک دیہاتی کا قصہ

جیسے ایک دیہاتی کا قصہ حضرت والا نے لکھا ہے کہ ایک دیہاتی بیٹھا ہوا اپنی دیہاتی زبان میں یہ کہہ رہا تھا کہ یوں جی کرے ڈھیر سارا دودھ ہو، اور ڈھیر سارا گڑ ہو اور میں ڈھیر سارے دودھ میں ڈھیر سارا گڑ ڈال کر اُنگڑ (انگلی) سے اس کو چلاؤں اور پھر خوب پیوں، یوں جی کرے۔ کسی نے اس دیہاتی سے کہا کہ تیرا یوں جی تو کرے، لیکن تیرے پاس کچھ ہے بھی؟ اس نے کہا میرے پاس اُنگڑ (انگلی) ہے۔ یعنی نہ دودھ ہے اور نہ گڑ ہے، بس انگڑ ہے، اب وہ اس انگڑ کے بل بوتے پر آرزو کر رہا تھا۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ "جیسے وہ بیوقوف اُنگڑ کی بنیاد پر یہ آرزو باندھ رہا تھا، حالانکہ صرف آرزو باندھنے سے کچھ نہیں ہوتا، ایسے ہی ہم بھی اصلاح کی محض آرزوئیں باندھا کرتے ہیں۔ ارے یہ دیکھو! تمہارے پاس کچھ عمل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اس کے حصول کے لئے کوشش اور محنت کرو تب جا کر وہ حاصل ہوگا۔

یہ عاجز بندہ ہے

لہٰذا کوئی کام محض آرزو کر لینے سے نہیں ہوتا کہ کاش میں ایسا ہو جاؤں، کاش میں نیک ہو جاؤں، کاش میں متقی بن جاؤں، کاش میں غیبت چھوڑ دوں، محض تمنائیں کرنے سے اور آرزوئیں کرنے سے بات نہیں بنتی۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

العاجز من أتبع نفسه هواها وتمنّٰى على الله

(ترمذی، باب صفۃ القیٰمۃ حدیث نمبر ۲۴۶۱)

عاجز وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو خواہشات نفسانی کے پیچھے چھوڑ رکھا ہو۔ خواہشات جس طرح لے جارہی ہیں وہ جارہا ہے، کوئی روک اور لگام نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ پر تمنائیں باندھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے، معاف کردے گا، ایسا بندہ عاجز ہے۔ لہٰذا محض تمنا اور آرزو کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ تمنا کے ساتھ ساتھ قدم آگے بڑھائے، تھوڑی سی محنت کرے، عمل کرے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے کہے کہ یا اللہ! میرے بس میں جتنا تھا، اتنا میں نے کرلیا، اب اس کی تکمیل کرنا آپ کے قبضہ وقدرت میں ہے، آپ اس کی تکمیل فرمادیجئے۔

ذرا چلو تو سہی

کیا اللہ تعالیٰ ہمیں مشقت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ میرا یہ بندہ ذرا سا میری طرف چلے، جب وہ چلے گا تو ہم خود اس کی رہنمائی کریں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا

(العنکبوت:۶۹)

جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کریں گے ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلیں گے۔ ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ اٹھالیں گے

حضرت والا اس کی ایک مثال دیتے ہیں کہ جیسے ایک بچہ چلنا سیکھتا ہے، اور باپ یہ چاہتا ہے کہ میرا بیٹا چلنا سیکھ لے، تو اب باپ ذرا دور کھڑے ہو کر بچے کو بلاتا ہے کہ بیٹا میرے پاس آؤ، جب وہ بیٹا ذرا سا قدم بڑھاتا ہے اور گرنے لگتا ہے تو باپ جلدی سے اس کو گود میں اُٹھالیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف چلے گا اور قدم بڑھائے گا اور پھر وہ گرنے لگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو گرنے نہیں دیں گے بلکہ آگے بڑھ کر اس کو تھام لیں گے۔ جب ایک باپ اور ماں اپنی اولاد کے ساتھ یہ معاملہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ جو رحمٰن الرحیم ہے، اور جو ماں اور باپ کا خالق ہے، جس نے ماں اور باپ کے دل میں شفقت اور محبّت ڈالی ہے، کیا وہ اپنے بندوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا؟ بس اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میرا بندہ میرے راستے پر چلا ہے، اس نے تھوڑی سی محنت کی ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود ہی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔

غیبت کا ایک عجیب عملی علاج

پھر حضرت والا نے آگے ایک عجیب عملی علاج بیان فرمایا۔ یہ علاج کڑوا تو ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اس علاج کی توفیق دیدے تو چند دن میں غیبت چھوٹ جائے، فرمایا کہ:

> "غیبت کا ایک عجیب و غریب عملی علاج یہ ہے کہ جس کی غیبت کرے، اس کو اپنی اس حرکت کی اطلاع کر دیا کرے،

تھوڑے دن اس پر مداومت سے انشاء اللہ یہ مرض بالکل دفع ہو جائے گا۔"

(انفاس عیسیٰ ص ۵۳)

جب کسی شخص کی غیبت ہو جائے، جاکر اس کو بتادو کہ آج میں نے تمہاری یہ غیبت کی ہے، جس وقت جاکر یہ بتائے گا اس وقت دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ "آرا" ہی اس بیماری کا آپریشن کرے گا، اگر چند مرتبہ یہ عمل کرلیا تو انشاء اللہ یہ بیماری جڑ سے نکل جائے گی۔اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آدمی دوسرے سے جاکر کہے گا کہ میں نے۔تمہاری غیبت کی تھی، اس دوسرے آدمی کے دل میں بھی نرمی پیدا ہوگی کہ یہ شخص چونکہ ندامت اور پشیمانی کے ساتھ میرے پاس آیا ہے، چلو اس کو معاف کردو، چنانچہ غیبت کے نتیجے میں جو عداوت اور دشمنی اور اشتعال پیدا ہوتا ہے، وہ اشتعال پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

گیارہویں مجلس

بدگمانی اور تجسس۔ اور ان کا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

گیارھویں مجلس

بدگمانی اور تجسّس اور اس کا علاج

الحمد للہ رب العالمین ۔ والصلاة والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ۔

أمّا بعد! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ يٰاَ يُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضاً ۔

(سورۃ الحجرات آیت ۱۲)

بدگمانی اور تجسّس ایسے گناہ ہیں جن کو ہم نے گناہ سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے، حالانکہ قرآن کریم کی نص صریح ہے کہ دوسرے کے خلاف بدگمانی کرنا بھی حرام ہے اور تجسّس کرنا یعنی دوسرے کی ٹوہ میں لگنا کہ یہ کیا غلط کام کر رہا ہے، اور

دوسرے کے عیب تلاش کرنا بھی حرام ہے۔

قرآن کریم نے صاف لفظوں میں فرمادیا "وَلَا تَجَسَّسُوْا" دوسرے کی ٹوہ میں نہ لگو، بلکہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے کام سے کام رکھے، دوسرے کی فکر میں نہ پڑے۔ اسی طرح بدگمانی کرنا بھی حرام ہے، کسی کے بارے میں اگر کوئی بات سامنے آئی ہے تو آدمی کو چاہئے کہ اس کے بارے میں نیک گمانی کرے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ظُنُّوا بِالمؤمنین خیراً۔

مؤمنین کے ساتھ نیک گمان رکھو۔

خواہ مخواہ بلاوجہ بدگمانی کرنا کہ اس نے یہ کیا ہوگا، اس نیت سے کیا ہوگا، یہ بدگمانی ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا:

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔

یعنی بعض گمان براہ راست گناہ ہوتے ہیں۔

معاشرتی خرابیوں کا سبب

یہ سب کام ناجائز اور حرام ہیں اور قرآن و حدیث کی نصوص ان کے خلاف صریح ہیں، ان میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اور یہ گناہ معاشرتی خرابیاں پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں، معاشرے میں آپس میں نااتفاقیاں، ناچاقیاں، ایک دوسرے سے لڑائیاں یہ سب بدگمانی اور تجسس سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ دونوں بڑے گناہ ہیں اور بہت سے فتنوں کی جڑ ہیں۔

ہمارے معاشرے کی حالت

لیکن ہمارا معاشرہ ان دونوں سے بھرا ہوا ہے، ہر شخص اپنی طرف سے دوسرے کے بارے میں ایک گمان قائم کر لیتا ہے اور پھر اس پر ایسا یقین کر لیتا ہے جیسے اس نے اپنی آنکھوں سے اسے وہ کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ذرا سی بات علم میں آگئی، بس اس پر اپنی طرف سے مفروضوں کا محل تعمیر کر لے گا، پھر ان مفروضوں کو دوسروں کی طرف منسوب کر دے گا کہ اس نے ایسا کیا ہوگا۔ پھر بعد میں "کیا ہوگا" بھی نہیں رہتا بلکہ "کیا ہے" ہو جاتا ہے۔

آیت قرآنی میں عجیب ترتیب

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ قرآن کریم کی اس آیت:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا

(سورۃ الحجرات آیت ۱۲)

کی تفسیر کے تحت بیان فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عجیب ترتیب قائم فرمائی ہے، وہ یہ کہ پہلے تو یہ فرمایا کہ بدگمانی مت کرو، یعنی کسی شخص کے بارے میں کسی بات کا کوئی قرینہ اور شائبہ معلوم ہوا تو آپ اس کی تحقیق کیے بغیر اس کے بارے میں بدگمانی کر کے بیٹھ گئے، یہ فعل تو حرام ہے۔ اب جو شخص بدگمانی کر رہا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ اچھا آپ نے بدگمانی کو تو منع کر دیا کہ بلا تحقیق کے کسی کے بارے میں بدگمان مت ہو جاؤ۔ تو اچھا مجھے تحقیق کرنے کی اجازت

دیدو تاکہ میں تحقیق کروں کہ آیا اس نے یہ گناہ کیا یا نہیں؟ یہ عیب اس کے اندر موجود ہے یا نہیں؟ تو اب دوسرے مرحلے پر قرآن کریم نے یہ حکم دیدیا کہ "وَلَا تَجَسَّسُوْا" یعنی اگر تم کسی کے گناہ کی اور عیب کی تحقیق کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اس تحقیق کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ تمہیں اس کے گناہوں کی کیا پڑی ہے کہ تم اس کی فکر میں لگ گئے کہ اس نے یہ گناہ کیا ہے یا نہیں؟

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کا جواب اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ دے گا، تمہیں اس کی تحقیق کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے تجسّس کرنا منع ہے۔

تجسّس اور تحسّس میں فرق

حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے دو لفظ استعمال فرمائے، فرمایا:

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَحَسَّسُوْا

نہ تجسّس کرو اور نہ ہی تحسّس کرو،

"تجسّس" کے معنی وہ ہیں جو اوپر بیان کئے یعنی انسان اس فکر میں پڑے کہ دوسرے کا عیب مجھے معلوم ہو جائے، چاہے اس کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کرے۔ اور "تحسّس" کے معنی وہ ہیں جس کو اردو میں "کنسوئے لینا" کہتے ہیں۔ یعنی کسی کی راز کی بات چپکے سے سننے کی کوشش کرنا، وہ چھپانا چاہتا ہے اور یہ سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "تجسّس

اور تحسّس" دونوں کو حرام قرار دیدیا۔

تجسّس کیوں حرام ہے؟

کیوں حرام قرار دیا؟ اس لئے کہ تجسّس کرنا یا تحسّس کرنا اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنے عیب سے بے خبر اور بے فکر ہے، اگر اسے اپنے عیب کی فکر ہوتی تو کبھی دوسرے کے عیوب کی تجسّس میں نہ پڑتا۔ جس آدمی کے خود پیٹ میں درد ہو رہا ہو اور وہ اس درد سے بیتاب اور بے چین ہو، کیا اس کو یہ فکر ہوگی کہ فلاں کو نزلہ ہے یا نہیں؟ فلاں کو کھانسی ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ اس کو اپنی فکر پڑی ہوئی ہے، وہ اپنے درد سے بے چین ہے، جب تک اس درد سے اس کو سکون نہ مل جائے، وہ اس وقت تک دوسرے کی طرف کیسے دیکھے!

اپنے عیوب کی فکر کرو

اگر ہم لوگوں کو اپنے عیب کی فکر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر میرا کیا انجام ہونا ہے؟ آخرت میں میرا کیا حال ہوگا؟ جب یہ فکر پیدا ہو جائے تو پھر دوسرے کی طرف نگاہ پڑ ہی نہیں سکتی۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم فرماتے ہیں ؎

تھے جب اپنے عیوب سے بے خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب تک اپنی برائیوں سے بے خبر تھے، اس وقت تک یہ حال تھا کہ کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اور انہی کو برا سمجھ رہے ہیں، لیکن جب اپنے عیوب پر نگاہ پڑی تو کوئی برا نہ رہا۔

حضرت تھانویؒ کی حالت

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے عیوب کی فکر عطا فرماتے ہیں، ان کو تو ساری دنیا اچھی نظر آتی ہے۔ حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو اس صدی کے مجدّد تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"میں تمام مسلمانوں کو اپنے آپ سے حالاً اور تمام کافروں کو اپنے آپ سے مآلاً افضل سمجھتا ہوں۔

یعنی مسلمان تو سارے کے سارے اس وقت بھی مجھ سے افضل ہیں اور کافروں کو بھی آئندہ کے اعتبار سے افضل سمجھتا ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کو کسی وقت ایمان کی توفیق دیدے اور مآل اور انجام کے اعتبار سے وہ بھی مجھ سے آگے نکل جائیں، اس لئے میں ان کو بھی افضل سمجھتا ہوں۔ جب اتنے بڑے آدمی کا یہ حال ہے تو ہماشما کس شمار قطار میں ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ اپنے عیوب کی فکر عطا فرماتے ہیں وہ ساری دنیا کو اپنے سے افضل سمجھتا ہے، وہ دوسروں کے عیوب کی فکر میں نہیں رہتا ہے۔

لہٰذا اپنی فکر کرو کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ کیا عمل کر رہے ہو؟ کیا کیا عیب تمہارے اندر موجود ہیں؟ کیا کیا خرابیاں تمہارے اندر پائی جاتی ہیں؟ ان کو دور

کرنے کی فکر کرو۔ دوسروں کی فکر کرنا، دوسروں کا تجسس کرنا، ان کی ٹوہ میں لگنا، دوسروں کے بارے میں بدگمانی اور غیبت کرنا حرام ہے، اور اس کے ذریعہ ہم اپنی دنیا بھی خراب کر رہے ہیں اور آخرت بھی خراب کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل و کرم سے ان برائیوں سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مذموم بدگمانی کونسی؟

بہر حال، اس بدگمانی اور تجسس کے بارے میں حضرت والا کے ملفوظات ہیں:

> فرمایا کہ بدگمانی تکبر سے پیدا ہوتی ہے۔ مذموم بدگمانی وہ ہے جو خود لائی جائے، باقی جو وسوسہ خود آئے وہ مذموم بدگمانی نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو، اور عمل کی صورت یہ ہے کہ یا دل سے اس پر اعتقاد جازم کرلے یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کر دے، جب تک وسوسہ پر عمل نہ ہو اس وقت تک نہ اس پر مواخذہ ہے نہ وہ مضر ہے۔
>
> (انفاس عیسیٰ: ۱۵۳)

ایک شخص کے طرز عمل سے اس کے بارے میں آپ کو کچھ شبہ ہوا، اور دل میں وسوسہ آیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فلاں کام کیا ہوگا، اگر دل میں یہ وسوسہ خود بخود آیا اور خود بخود دل میں شبہ پیدا ہوا تو اس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ

اس میں آپ کے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔

دوسرے کے عمل کی تاویل کرو

مثلاً رمضان کے دن میں آپ نے ایک شخص کو ہوٹل سے نکلتے دیکھا، آپ کے دل میں خیال آئے گا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے روزہ توڑا ہے، اب یہ جو خیال دل میں خود بخود پیدا ہوا، یہ کوئی گناہ نہیں۔ البتہ آدمی کو چاہئے کہ حتی الامکان اس کے اس عمل کو صحیح محمل پر محمول کرے۔ مثلاً یہ کہ یہ شخص جو ہوٹل سے نکل رہا ہے، شاید یہ اپنے بیمار کے لئے کھانا خریدنے گیا ہوگا یا کسی آدمی سے بات کرنے کے لئے ہوٹل کے اندر گیا ہوگا۔ یہ احتمالات بھی موجود ہیں، لہٰذا دل میں یہ احتمالات پیدا کرے کہ شاید ایسا ہوا ہو، زیادہ تحقیق میں پڑنے کے ہم مکلف نہیں۔

یہ بدگمانی حرام ہے

لہٰذا خود بخود دل میں جو خیال آیا تھا، وہ گناہ نہیں، اس پر مؤاخذہ بھی نہیں، لیکن اگر دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا، اس پر آپ نے پہلے اعتقاد اور یقین کر لیا کہ یہ صاحب ہوٹل میں روزہ توڑنے کے لئے داخل ہوئے تھے اور کھانا کھا کر باہر آئے ہیں، اس کا یقین کر لیا اور دوسرے احتمالات کی طرف دھیان نہیں کیا، اور پھر اس سے آگے بڑھ کر یہ کیا کہ دوسروں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیا کہ میں نے خود اس کو روزہ میں کھاتے ہوئے دیکھا ہے، حالانکہ اس نے صرف یہ دیکھا تھا کہ وہ شخص ہوٹل سے نکل رہا تھا، کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن

دوسروں کے سامنے اس طرح بیان کر رہا ہے جیسے خود اس نے کھاتے ہوئے دیکھا تھا، اور سو فیصد یقین کے ساتھ دوسروں سے کہہ رہا ہے کہ یہ شخص روزہ خور ہے، یہ بدگمانی حرام اور ناجائز ہے۔

اس لئے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ دل میں خود بخود کسی کے بارے میں کوئی گمان پیدا ہو جانا، یہ کچھ گناہ نہیں، لیکن اس گمان پر سو فیصد یقین کر بیٹھنا اور پھر اس یقینی انداز میں اس کا تذکرہ کرنا گناہ ہے۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ:

> "مذموم بدگمانی وہ ہے جو خود لائی جائے، باقی جو وسوسہ خود آئے وہ مذموم بدگمانی نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو، اور عمل کی صورت یہ ہے کہ یا دل سے اس پر اعتقاد جازم کرلے (یعنی یقین کرلے، پہلے صرف گمان تھا پھر اس گمان کو یقین سے تبدیل کر دیا) یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کردے"

بدگمانی کے دو درجے

گویا کہ بدگمانی کے دو درجے ہوئے، ایک درجہ غیر اختیاری ہے، وہ یہ کہ اپنے کسی عمل کے بغیر دل میں کسی کی طرف سے کوئی گمان پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ دوسرا درجہ اختیاری ہے، وہ یہ کہ جو گمان دل میں پیدا ہوا، اس گمان کو لے کر بیٹھ گیا، اور اس سے مختلف باتیں نکال رہا ہے، اور اس پر یقین کر رہا ہے، یا اس کا تذکرہ دوسروں کے سامنے کر رہا ہے۔ یہ دوسرا درجہ

حرام ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔

بدگمانی کا منشاء کبر ہے

آگے حضرت والا نے بدگمانی کا علاج بیان فرمایا کہ:

"جب کسی سے بدگمانی پیدا ہو جس کا منشا کبر ہے، تو اپنے عیوب کو پیش نظر کر لیا کرو۔

(انفاس عیسیٰ: ۱۵۳)

یہ اس کا علاج ہے۔ یعنی دوسرے کے بارے میں دل میں برا گمان آیا، دل میں بُرا خیال آیا، بدگمانی پیدا ہوئی، اگرچہ وہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ غیر اختیاری بدگمانی بھی اگر دل میں زیادہ دیر جمی رہے گی تو گناہ کے اندر مبتلا کر دے گی، یا تو دل میں یقین پیدا کر دے گی یا دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ کرا دے گی۔ اس لئے اس کے علاج کی بھی فکر کرنی چاہئے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چنگاری آکر گر پڑی، اور آپ نے اس کو بجھایا نہیں، تو وہ چنگاری کسی بھی وقت شعلہ بن جائے گی۔ اسی طرح غیر اختیاری گمان کا بھی علاج کرنا ضروری ہے، وہ علاج یہ ہے کہ اپنے عیوب کو پیش نظر کر لے کہ میرے اندر تو فلاں فلاں عیب ہیں تو دوسرے کو کیا دیکھوں، اور اس کے بارے میں کیا گمان کروں، میری حالت خود خراب ہے، میرے اندر فلاں عیب ہے، میرے اندر فلاں عیب ہے۔ لہٰذا اپنے عیوب کے استحضار کرنے سے یہ بیماری رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔

تجسّس اور بدگمانی کی انتہاء "غیبت" ہے

آگے حضرت والا نے فرمایا:

"بدگمانی، تجسّس، غیبت، ان سب کا منشا کبر ہے، بلکہ متکبر کی غرض پوری طرح غیبت ہی سے حاصل ہوتی ہے، بدگمانی اور تجسّس سب اسی کے مقدمات ہیں۔ اگر کوئی شخص تجسّس اور بدگمانی کرے، مگر غیبت نہ کرے تو اس کا مقصود حاصل نہ ہوگا، اس لئے وہ بدگمانی اور تجسّس کو بھی ترک کر دے گا۔ پس غیبت سب سے اشد ہے۔"

(ایضاً)

یعنی یہ تینوں بیماریاں، بدگمانی، تجسّس اور غیبت، یہ سب ایک اور بیماری سے پیدا ہوتی ہیں، وہ ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، جب آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے تب ہی وہ دوسرے سے بدگمان ہوتا ہے، اور تب ہی دوسرے کی ٹوہ میں لگتا ہے کہ اس کا کوئی عیب میرے ہاتھ آجائے، اور تب ہی اس کی غیبت کرتا ہے۔ اور اصل ان تینوں میں سے غیبت ہے، اور متکبر کو اصل مزہ تو غیبت کرنے میں آتا ہے، لیکن غیبت کی تمہید کے طور پر وہ متکبر بدگمانی اور تجسّس کو استعمال کرتا ہے کہ جب میں بدگمانی اور تجسّس کروں گا تو اس کے نتیجے میں غیبت کرنے کا موقع ملے گا۔ لہٰذا بدگمانی اور تجسّس غیبت کے مقدمات ہیں، کیونکہ تجسّس کے نتیجے میں کوئی عیب ظاہر ہوگا تو اس کو لوگوں کے سامنے بیان کروں گا اور بدگمانی کے نتیجے میں کوئی عیب دل میں آئے گا تو اس کو لوگوں کے سامنے بیان کروں گا۔

لہٰذا آخری نتیجہ تو غیبت ہے جو متکبر کی اصل غرض ہے۔ ایسا آدمی ملنا مشکل ہے جو بدگمانی کرے اور تجسس بھی کرے لیکن پھر آگے غیبت نہ کرے، کیونکہ وہ بدگمانی اور تجسس اسی لئے کر رہا ہے کہ وہ غیبت کا مزہ لینا چاہتا ہے۔ اصل مقصود تو غیبت ہے، یہ بدگمانی اور تجسس تو درمیان کے آلے اور واسطے ہیں۔ لہٰذا ان سب بیماریوں میں سب سے زیادہ اشد اور قابل توجہ بیماری "غیبت" ہے۔ اگر غیبت چھوٹ گئی تو پھر بدگمانی اور تجسس بآسانی چھوٹ جائیں گی۔

بدگمانی میں گناہ کا درجہ

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ:

"بدگمانی میں گناہ کا درجہ تو وہ ہے جس کا ذہن میں اعتقاد راسخ ہو، اگر راسخ نہ ہو تو مضر نہیں، مگر علاج اس کا بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ اپنے عیوب کو پیش نظر رکھے، پھر اگر علاج کے بعد کچھ اثر رہے تو وہ مذموم نہیں۔"

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

یعنی بدگمانی میں گناہ اس وقت ہے جب اس بدگمانی پر یقین کرلے، لیکن اگر یقین نہ کرے بلکہ محض احتمال کے درجے میں دل کے اندر موجود ہے کہ شاید اس نے یہ کام کیا ہو تو وہ مضر نہیں اور اس غیر اختیاری احتمال پر گناہ بھی نہیں۔ مثلاً رمضان میں کسی کو دن میں ہوٹل سے نکلتا ہوا دیکھا تو دل میں یہ خیال آیا کہ شاید اس نے روزہ توڑ دیا ہو، لیکن اس پر یقین نہیں کیا، یہ مضر تو نہیں لیکن علاج اس کا بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ خیال ابھی چنگاری کے درجے میں ہے، ابھی

شعلہ نہیں بنی، لیکن کسی بھی وقت شعلہ بن کر تمہیں خاکستر کردے گی۔ لہٰذا اس کا بھی علاج کرے، وہ یہ کہ اپنے عیوب کو پیش نظر رکھے۔ البتہ علاج کے بعد اب بھی تھوڑا بہت بدگمانی کا خیال دل میں آتا ہے تو وہ مذموم نہیں، کیونکہ یہ اختیار سے باہر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر صحیح طور پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

بارہویں مجلس

بدگمانی اور تجسس کا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

بارھویں مجلس

الحمد لله رب العالمین والعاقبة للمتقین۔
والصلاة والسلام علی رسوله الکریم وعلی آله
واصحابه اجمعین۔ اما بعد:

بدگمانی اور تجسّس اور غیبت سے بچنے کے تین علاج

حضرت والا نے فرمایا کہ:

"بدگمانی، تجسّس اور غیبت کا علاج یہ ہے کہ تواضع اختیار کرو، تکبر کو دل سے نکالو، اور جب تک اصلی مرض زائل نہ ہو اس وقت تک غیبت کا فوری علاج یہ کرو کہ (۱) فکر و تأمل سے کام لو (۲) اور کوتاہی پر جرمانہ مقرر کرو (۳) اور وسوسہ بدگمانی کے وقت توجہ کو ذکر اللہ وغیرہ کی طرف منعطف کرو۔"

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو علاج تجویز فرمائے ہیں۔ ایک علاج

پائیدار، دوسرا علاج وقتی اور فوری۔ پھر فوری اور وقتی علاج کی بھی تین صورتیں بیان فرمائیں۔ پہلا علاج یہ ہے کہ فکروتامل سے کام لو۔ یعنی بات کرنے سے پہلے سوچو کہ یہ بات زبان سے نکالوں یا نہ نکالوں، پہلے تولو پھر بولو۔

امام شافعیؒ کا سکوت

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی شخص سوال کرتا تو آپ خاموش رہتے، فوراً جواب نہیں دیتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں لیکن آپ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ جواب میں فرمایا:

حتی اعرف ان الفضل فی السکوت او فی الکلام

یعنی میں اس وقت تک خاموش رہتا ہوں جب تک میرے سامنے یہ واضح نہ ہو جائے کہ بہتری بولنے میں ہے یا خاموش رہنے میں ہے۔

یہ درحقیقت اس مقولے پر عمل ہو رہا تھا کہ "پہلے تولو پھر بولو"۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زبان کو سزا دینا

روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی زبان کو بیٹھے ہوئے مروڑ رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ جواب دیا کہ:

ان ھذا اوردنی الموارد

اس زبان نے مجھے ہلاکت کی جگہوں میں ڈالا ہے۔

یہ کون کہہ رہا ہے؟ صدیق اکبرؓ "صدیق" کون ہوتا ہے؟ نبی کا آئینہ، وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس زبان نے مجھے ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ فکر عطا فرماتے ہیں، وہ اس طرح زبان کا استعمال کرنے میں احتیاط اور اس کا استحضار رکھنے کی تدبیر کرتے ہیں۔

لہٰذا اگر انسان زبان کو صحیح استعمال کرے تو بڑی اچھی چیز ہے، اور اگر اس کو غلط استعمال کرے تو یہ بڑی خراب چیز ہے۔ یہی زبان جنّت میں لے جانے والی ہے، اور یہی زبان جہنّم میں ڈالنے والی ہے۔ اگر دل کے یقین کے ساتھ زبان سے یہ کلمہ " اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً رسول الله " پڑھ لیا، تو کافر جہنّم سے جنّت میں پہنچ جائے گا۔ اور اگر کسی مسلمان نے اس زبان سے کفر بول دیا تو وہ مسلمان سیدھا جہنّم میں پہنچ جائے گا۔ حدیث شریف میں ہے کہ لوگ اپنی زبان کے کرتوت کی وجہ سے جہنّم کے اندر اوندھے منہ ڈالے جائیں گے۔ اس زبان کا بے محابا استعمال کہ جو منہ میں آیا بک دیا، جو سمجھ میں آیا کہہ گزرے، اس کو چھوڑو اور بولنے سے پہلے سوچنے کی عادت ڈالو کہ یہ زبان سے جو کلمہ نکال رہا ہوں یہ کہیں مجھے ہلاکت میں تو نہیں ڈال دے گا۔

خاموش رہنے کا مجاہدہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، وہ بہت بولتے تھے، آتے ہی بولنا شروع کر دیتے اور پھر کوئی انتہاء نہیں ہوتی تھی۔

والدصاحب برداشت کرتے تھے۔ چند روز کے بعد ان صاحب نے کہا کہ حضرت! میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں اور اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت والد صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتے ہو تو پہلا کام یہ کرو کہ اس زبان پر تالا لگاؤ، یہ زبان جو قینچی کی طرح چل رہی ہے اس کو روکو، بس یہی تمہارا وظیفہ اور علاج ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جب وہ مجلس میں آتے تو خاموش بیٹھے رہتے اور اسی علاج کے ذریعے ان کی اصلاح ہو گئی۔

غیبت ہونے پر جرمانہ

اس لئے بولنے میں فکر اور تأمل سے کام لو کہ میں جو بول رہا ہوں یہ غیبت ہے یا جھوٹ ہے، جائز ہے یا ناجائز ہے، حرام ہے یا حلال ہے، اس کو پہلے سوچو، اور اگر تأمل اور غور و فکر کرنے کے باوجود اور توبہ واستغفار کرنے کے باوجود پھر بھی کوتاہی ہو جائے اور غیبت سرزد ہو جائے تو پھر اپنے اوپر جرمانہ مقرر کرو کہ آئندہ جب کبھی غیبت ہو گی تو اتنے پیسے ادا کروں گا۔ لیکن پیسے اتنے ہونے چاہئیں جن کو نکالنے میں تھوڑی سی تکلیف ہو، اتنا کم نہ ہو جیسے علیگڑھ کالج میں تھا۔

نماز چھوڑنے پر جرمانہ

علیگڑھ کالج میں تمام طلبہ کو مسجد میں نماز پڑھنا ضروری تھا، اگر کوئی حاضر نہ ہوتا تو فی نماز چار آنے جرمانہ ادا کرنا ضروری ہوتا۔ چنانچہ جو طلبہ بڑے بڑے رئیسوں کے بیٹے ہوتے وہ مہینے کے شروع میں ہی پورے مہینے کا جرمانہ جمع کرا دیتے۔ لہٰذا جرمانہ ایسا ہونا چاہئے جس کے ادا کرنے میں تھوڑی سی مشقت بھی ہو۔

اور یا یہ جرمانہ مقرر کرو کہ جب کبھی غیبت ہو گی تو چار رکعتیں نفل پڑھوں گا۔ اس کے نتیجے میں ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمادیں گے۔

اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاؤ

ایک علاج یہ بھی ہے کہ جب کبھی دوسرے کی طرف سے بدگمانی کا خیال آئے تو اپنی توجہ کو ذکر اللہ کی طرف منعطف کر دو، مثلاً استغفر اللہ پڑھنا شروع کر دو، کلمہ پڑھنا شروع کر دو، کوئی تسبیح پڑھنا شروع کر دو اور اپنی توجہ اس طرف سے پھیر لو۔

تواضع پیدا کرو

یہ تو وقتی علاج تھے، مستقل علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرو، کیونکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ یہ ساری بیماریاں تکبر کے ہونے سے اور تواضع کے نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ دل میں اپنی بڑائی ہے کہ جو میں سوچتا اور سمجھتا ہوں، وہ درست ہے، میں بڑا عقل مند ہوں، میں بڑا عالم ہوں، میں بڑا پارسا ہوں، یہ سب تکبر کے خیالات ہیں جو انسان کے اندر غیبت، بدگمانی اور تجسس کا داعیہ پیدا کرتے ہیں۔ ان سب کا علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرو۔

اپنی حقیقت میں غور کرو

اب تواضع کیسے پیدا ہو؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی شیخ کا دامن پکڑ لو، کیونکہ شیخ کے سامنے رگڑے کھائے بغیر کام نہیں بنتا، اس کی چپت کھاؤ، اس کی

ڈانٹ کھاؤ، اس کے ساتھ لگے لپٹے رہو، اس کی نگاہوں کو برداشت کرو، اس کے خلاف طبع امور کو برداشت کرو، تو انشاء اللہ رفتہ رفتہ تواضع پیدا ہو جائے گی۔ اور جب تک شیخ نہ ملے یا شیخ سے تعلق قائم نہ ہو، اس وقت تک کم از کم اتنا کرو کہ اپنی حقیقت کو سوچا کرو کہ میری حقیقت کیا ہے؟ میری ذات میں کوئی کمال ہے؟ جو کچھ میرے اندر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اگر صحت ہے وہ بھی اللہ کی عطا ہے، اگر میرے اندر حسن ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر علم میرے پاس ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر پیسہ ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اور وہ جب چاہے ان کو واپس لے لے۔ ایک آدمی بڑا صحت مند اور تندرست ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ چاہیں اس کی صحت کو واپس لے لیں۔

ایک صاحب کی قوت اور کمزوری

میرے ایک عزیز تھے، جن کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی قوت دی تھی کہ برف کی سل کو ایک مکا مار کر توڑ دیتے تھے۔ تربوز کو کبھی چھری سے نہیں کاٹتے تھے، بس ہاتھ مارا اور توڑ دیا۔ آخر عمر میں جب بیمار ہوئے تو میں ان کی عیادت کے لئے گیا، دیکھا کہ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں اور ہاتھ اوپر اٹھانے کی طاقت بھی نہیں تھی، جب مجھے دیکھا اور ملاقات ہوئی تو میں نے دل میں کہا کہ یہ وہی "حامد" ہے جو برف کی سل اپنے ہاتھ سے توڑ دیا کرتا تھا، اور اب یہ حالت ہے کہ ہاتھ خود سے نہیں اٹھا سکتا۔ لہٰذا انسان کس بات پر ناز اور فخر کرے۔

عِلم پر ناز نہ کریں

مولوی کو عِلم کا بہت ناز ہوتا ہے کہ میں بڑا عالم ہوں، مجھے بہت کچھ آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہیں اس علم کو سلب فرمالیں۔ چنانچہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ دکھادیتے ہیں کہ کاغذ قلم لے کر لکھنے بیٹھے تو اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھیں، جبکہ ہمیں اپنے لکھنے پر ناز ہے، ہم بڑے اچھے اہل قلم ہیں۔ بعض اوقات اپنے نام کے ہجے نہیں آتے کہ کس طرح اپنا نام لکھیں۔ لہٰذا انسان کس چیز پر ناز کرے، کس چیز پر اکڑے، کس چیز پر بھروسہ کرے، جو کچھ حاصل ہے، وہ سب ان کی عطا ہے، وہ جب چاہیں سلب کرلیں۔ جس دن یہ بات دل میں بیٹھ گئی اور اپنی بڑائی کا احساس دل سے نکل گیا کہ میں تو کچھ نہیں ہوں، ذرّہ ناچیز ہوں، بے مقدار ہوں، ہیچ در ہیچ ہوں، بس اس دن انشاء اللہ تواضع پیدا ہو جائے گی۔

آڑ میں بیٹھ کر باتیں سننا

آگے ارشاد فرمایا:

آڑ میں بیٹھ کر کسی کی باتیں سننا بھی تجسس میں داخل ہے، جس کو آڑ میں بیٹھنا ہے تو زبان سے کہہ دینا چاہئے کہ میں بیٹھا ہوں یا اس کے سامنے بیٹھنا چاہئے، غرض کسی طرح اپنے بیٹھنے کی اطلاع کردے۔

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

مثلاً دو آدمی آپس میں باتیں کررہے ہیں اب آپ نے آڑ میں جاکر ان کی

باتیں سننا شروع کر دیں، یہ گناہ اور حرام ہے اور تجسس کے اندر داخل ہے۔ لہٰذا جو شخص آڑ میں بیٹھا ہو وہ باتیں کرنے والوں کو بتا دے کہ میں یہاں پردے میں بیٹھا ہوں، تاکہ اگر وہ راز کی باتیں کرنا چاہتے ہیں تو نہ کریں، یا ان کے سامنے آکر بیٹھ جائے۔

ہمارا طریقہ

آج ہمارے معاشرے میں سب کام الٹے ہو رہے ہیں۔ ایسے موقع پر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو چھپالیں، اور باتیں کرنے والوں پر یہ ظاہر نہ کریں کہ میں یہاں پر موجود ہوں، اور آرام سے بیٹھ کر ان کی باتیں سنوں۔ یاد رکھئے! یہ سب تجسس میں داخل ہے اور حرام ہے، ناجائز ہے۔ دیانت کا تقاضہ یہ تھا کہ تم اپنے وجود کو ان پر ظاہر کر دیتے تاکہ وہ لوگ سوچ سمجھ کر باتیں کرتے۔

لڑائی جھگڑے کی جڑ

ہماری شریعت نے ہمیں ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں کہ اگر واقعۃً ہم لوگ اس پر عمل کرلیں تو آپس میں کوئی جھگڑا پیدا ہی نہ ہو اور معاشرے میں کوئی فساد رونما ہی نہ ہو۔ جہاں کہیں فتنہ و فساد اور جھگڑا ہوتا ہے وہ شریعت کی کسی نہ کسی تعلیم کو چھوڑنے کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ شریعت نے فتنہ اور فساد اور جھگڑے کے راستے پر ایسے پہرے بٹھائے ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل کرلیں تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہ ہو۔ چنانچہ ایک طرف تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف میں یہ حکم دیا کہ:

لا یتناجی اثنان دون ثالث

یعنی اگر محفل میں تین آدمی ہیں، تو ان میں سے دو آدمیوں کو یہ نہیں کرنا چاہئے کہ آپس میں علیحدہ ہو کر اس طرح باتیں کرنے لگیں کہ تیسرا آدمی اکیلا رہ جائے، ایسا کرنا جائز نہیں، کیوں؟ اس لئے کہ تیسرے کو یہ احساس اور خیال ہو گا کہ انہوں نے مجھے اکیلا کر دیا اور میرے بارے میں کوئی بات کر رہے ہیں اور مجھ سے وہ بات چھپانا چاہتے ہیں، اس سے اس کی دل شکنی ہو گی۔ اس لئے دو آدمی علیحدہ ہو کر سرگوشی نہ کریں۔

ایسی جگہ پر مت جاؤ

اور دوسری طرف یہ حکم دیا کہ اگر پہلے سے دو آدمی سرگوشی کر رہے ہیں تو تیسرے کو چاہئے کہ وہ وہاں نہ جائے، تاکہ ان کی باتوں میں خلل واقع نہ ہو، ان کو اپنی باتیں کرنے دو، تم بیچ میں جا کر کیوں گھستے ہو؟ - یہ ساری باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتا دیں، لیکن ہم نے بس چند چیزوں کا نام دین رکھ لیا، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، بس قصہ ختم، دین کو اسی میں منحصر سمجھ لیا، زندگی گزارنے کے جو آداب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتائے ہیں، ان کو قطعی طور پر دین سے خارج ہی کر دیا، حالانکہ یہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔

فون پر دوسروں کی باتیں سننا

یا مثلاً ٹیلیفون ہے۔ اب آپ نے ٹیلیفون کرنے کے لئے ریسیور اٹھایا اور جب کان سے لگایا تو اس میں دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کسی دوسرے کی لائن آپ کے فون سے مل گئی تھی، آپ نے ان کی باتیں سننا شروع کردیں، حالانکہ آپ کے لئے فون پر ان کی باتیں سننا جائز نہیں، بلکہ آپ فون بند کردیں۔ اگر آپ ان کی باتیں سنیں گے تو وہ تجسس میں داخل ہے جو ناجائز اور حرام ہے۔

دوسروں کے خط پڑھنا

یا مثلاً دوسرے کا خط آپ کے ہاتھ لگ گیا، تو آپ کے لئے اس کی اجازت کے بغیر اس کا خط پڑھنا جائز نہیں۔ یہ بھی تجسس کے اندر داخل ہے اور گناہ ہے۔

جائز تجسّس

بعض اوقات انتظامی طور پر "تجسّس" ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ادارے کا سربراہ اور ذمّہ دار ہے، وہ اگر تجسّس نہ کرے تو ادارے میں فساد پھیل جائے، مثلاً ذمہ دار کا یہ تجسّس کرنا کہ کہیں ہمارے زیرِانتظام ادارے میں کوئی ایسا جرم تو نہیں ہو رہا ہے جو خطرناک قسم کا ہو۔ اس حد تک تجسّس کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اب پولیس کے محکمے کو دیکھ لیں وہ تو تجسّس ہی کے کام کے لئے بنایا گیا ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کو مدینہ منورہ کی گلیوں میں

گشت کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ گشت کے دوران دیکھا کہ ایک گھر سے گانے کی آواز آرہی ہے اور کچھ گلاسوں کے کھڑکنے کی بھی آواز آئی، ان کو خیال ہوا کہ شاید یہاں پینے پلانے کا شغل ہو رہا ہے اور گانا بجانا بھی ہو رہا ہے، تھوڑی دیر تو آپ سب سنتے رہے، پھر دیوار پھاند کر اندر داخل ہوگئے، اور دیکھا کہ وہاں شراب پی جارہی ہے اور گانا بجانا ہو رہا ہے، چنانچہ آپ نے رنگے ہاتھوں ان کو پکڑ لیا۔ ان کا جو سربراہ تھا، وہ بڑا ہوشیار تھا، اس نے پوچھا کہ آپ نے ہمیں کیوں پکڑا؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تم شراب پی رہے تھے اور گانا بجانا کر رہے تھے، تم مجرم ہو، اس لئے تمہیں پکڑ لیا۔ ان کے سربراہ نے کہا کہ ہم نے تو ایک ہی گناہ کیا تھا اور آپ نے کئی گناہ کئے، ایک گناہ تو آپ نے یہ کیا کہ آپ نے تجسس کیا اور ہماری ٹوہ میں لگے کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ دوسرا گناہ یہ کیا کہ اجازت کے بغیر ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور اجازت کے بغیر دوسرے کے گھر میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تیسرا گناہ یہ کیا کہ دیوار پھاند کر داخل ہوئے، حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:

وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا۔

یعنی گھروں میں دروازے کے ذریعہ آؤ۔

لہٰذا ہم نے تو صرف ایک گناہ کیا تھا اور آپ نے تین گناہ کئے۔

آپؓ کا استغفار کرنا

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی یہ بات سن کر تینوں

گناہوں پر استغفار کیا کہ کہیں واقعی مجھ سے یہ گناہ سرزد نہ ہوگئے ہوں، اس لئے میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہتا ہوں۔ ہم جیسا ہوتا تو اس شخص کو دو تھپڑ مارتا کہ کم بخت ایک طرف تو یہ گناہ کرتا ہے اور دوسری طرف میرے اوپر یہ اعتراض کرتا ہے، چوری اور سینہ زوری۔ لیکن چونکہ یہ حضرات ساتھ ساتھ اپنے نفس کا بھی علاج کیا کرتے تھے، اس لئے انہوں نے یہ سوچا کہ چونکہ میری ذات پر اعتراض آیا ہے، تو اس کی مدافعت نہ کرنی چاہئے، بلکہ اس کے اندر جس خرابی کا احتمال ہے، اس کا تدارک کرنا چاہئے۔ اس لئے فوراً استغفار کیا۔

صحابہ کرامؓ کا فیصلہ

پھر یہ مسئلہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے سامنے پیش کیا کہ یہ شخص مجھے یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے تین گناہ کئے۔ آیا واقعۃً میں نے تجسس کا گناہ کیا؟ اور یہ تجسس کرنا میرے لئے گناہ تھا یا نہیں تھا؟ اور میرا اس طرح دوسرے کے گھر میں داخل ہونا جائز تھا یا نہیں تھا؟ صحابہ کرامؓ کی اس جماعت نے مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ جو ذمہ دار آدمی ہے، اگر اس کو یہ اندیشہ ہو کہ یہ فساد ایسا ہے جو معاشرے میں پھیل جائے گا اور لوگوں کے اندر اس کے بُرے اثرات مرتب ہوں گے تو اس صورت اس ذمہ دار کے لئے تجسس کرنا بھی جائز ہے، اور اجازت کے بغیر اندر داخل ہونا بھی اس کے لئے جائز ہے، اور دیوار پھاندنا بھی جائز ہے۔ لیکن اگر متعدی خرابی کا اندیشہ نہ ہو، مثلاً ایک آدمی اپنے گھر میں کوئی ایسا عمل کر رہا ہے جس کا فساد اس کی ذات کی حد تک محدود ہے، اس کے بُرے اثرات دوسروں

تک متعدی نہیں ہوں گے، تو اس صورت میں ذمہ دار اور سربراہ کو بھی تجسّس کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ فقہاء کرامؒ نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے کہ کن حالات میں تجسّس جائز ہے اور کن حالات میں تجسّس جائز نہیں۔

فقہاء کا قول فیصل

امام خصّاف رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ادب القضاء" ہے، اس کی شرح علامہ صدر الشہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے۔ اس میں اس موضوع پر بہت طویل بحث کی ہے اور فقہاء کرام کا اختلاف نقل کیا ہے کہ کس حالت میں تجسّس جائز ہے اور کس حالت میں جائز نہیں۔ اس اختلاف میں قول فیصل یہ ہے کہ جہاں کسی متعدی بُرائی کا اندیشہ ہو تو وہاں سربراہ کے لئے سب کچھ کرنا جائز ہے، تجسّس کرنا بھی جائز، دیوار پھاندنا بھی جائز، اجازت کے بغیر اندر گھسنا بھی جائز۔ اور جہاں متعدی برائی کا اندیشہ نہ ہو بلکہ ایک شخص کا ذاتی عمل ہے، وہ اپنے گھر میں بیٹھا کر رہا ہے تو اس وقت سربراہ کے لئے بھی تجسّس کرنا جائز نہیں۔

دارالعلوم کراچی کی تھوڑی سی ذمہ داری ہمارے سپرد بھی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں یہ تجسّس کرنا پڑتا ہے کہ دارالاقامہ میں کیا ہو رہا ہے، طلبہ کن سرگرمیوں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہ اس وقت جائز ہے جب کسی متعدی خرابی کا اندیشہ ہو ورنہ سکوت افضل ہے۔

اپنے جاگنے کی اطلاع کر دے

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اسی طرح ایک آدمی سونے کو لیٹ گیا، اور دوسروں کو یہ خیال ہوا کہ یہ سو گیا ہے اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگیں، مگر یہ جاگ رہا تھا تو اس کو چاہئے کہ ان کو اطلاع کر دے کہ میں جاگ رہا ہوں، البتہ اگر وہ لوگ اسی کے متعلق باتیں کر رہے ہوں اور اس کو ضرر پہنچانا چاہتے ہوں تو تجسس کے ساتھ ان کی گفتگو سننا جائز ہے۔

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

آج کل الٹا معاملہ ہوتا ہے کہ جاگنے والا اپنے آپ کو اور زیادہ سوتا ہوا ظاہر کرتا ہے تاکہ ان کی گفتگو کے ذریعہ تمام رازوں کا پتہ چل جائے اور بعد میں وہ اپنی مہارت اور استادی دکھائے کہ تم نے جو جو باتیں کیں اس کا ہمیں پتہ چل گیا ہے۔ حالانکہ شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں، جاگنے والا بتا دے کہ میں جاگ رہا ہوں، یہ بھی شریعت کا حکم ہے۔ البتہ اگر وہ گفتگو کرنے والے اسی کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں اور اس کو نقصان پہنچانا چاہتے ہوں تو پھر اس طرح چپکے چپکے باتیں سننا جائز ہے تاکہ ان کے شر سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

زبان دانی کی اطلاع کر دے

آگے حضرت والا فرماتے ہیں کہ:

نیز اگر دو شخص انگریزی یا عربی میں گفتگو کر رہے ہوں، اور تیسرا شخص بھی ان زبانوں کو سمجھتا ہوں، مگر ان دونوں کو خبر نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ ان دونوں کو مطلع کر دے کہ

میں عربی یا انگریزی سمجھتا ہوں۔

(انفاس عیسیٰ: ۱۵۴)

تاکہ دھوکہ میں آکر اپنا راز فاش نہ کر دیں۔ مقصد یہ ہے کہ نہ تو انسان خود تجسس کرے اور نہ ہی تجسس کے اسباب پیدا کرے، اور نہ ہی دوسرے کو ایسی غلط فہمی میں مبتلا کرے جس سے وہ یہ سمجھے کہ یہ بے خبر ہے اور تم اس کی نادانستگی میں اس کے کسی راز پر مطلع ہو جاؤ۔

ایک بزرگ کا تجسس سے بچنا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں ایک بزرگ تھے، انگریزی تعلیم یافتہ تھے، مگر حضرت والا کی صحبت نصیب ہوئی تو ان کی وضع قطع بھی ایسی ہو گئی جیسے دیندار لوگوں کی اور مولویوں کی ہوتی ہے، چہرے پر ڈاڑھی، لمبا کرتا وغیرہ، وہ ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہے تھے، ان کے قریب ہی دو آدمی اور بیٹھے تھے، وہ بھی انگریزی دان تھے، وہ دونوں اِن کا حلیہ دیکھ کر یہ سمجھے کہ یہ کوئی مولوی ہے، ان کو انگریزی کیا آتی ہو گی، چنانچہ ان دونوں نے بیٹھ کر انہی کے بارے میں انگریزی میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ انگریزی میں باتیں کرنے کا مقصد ان سے چھپانا تھا کہ یہ مُلّا آدمی ہے، انگریزی کیا سمجھے گا۔ ابھی گفتگو شروع ہی کی تھی کہ یہ بزرگ سمجھ گئے کہ یہ دونوں صاحب مجھ سے چھپ کر کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں، اس لئے انگریزی میں باتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ یہ بات دیانت کے خلاف ہے کہ میں اسی طرح بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا رہوں، چنانچہ ان بزرگ نے ان دونوں سے کہدیا کہ ”میں انگریزی جانتا ہوں، اگر آپ کو مجھ

سے چھپ کر باتیں کرنی ہیں تو کوئی اور طریقہ اختیار کریں، اس دھوکے میں نہ رہیں کہ میں انگریزی نہیں جانتا، اگر آپ کہیں تو میں اٹھ کر چلا جاتا ہوں تاکہ آپ علیحدگی میں باتیں کرلیں۔

بہرحال، ان بزرگ کو یہ جو خیال آیا کہ یہ دونوں یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں زبان نہیں جانتا، اور مجھ سے چھپ کر باتیں کرنا چاہتے ہیں، اب اگر میں خاموش بیٹھا رہوں تو یہ "تجسّس" میں داخل ہو جائے گا، یہ خیال ان کے ذہن میں کیوں پیدا ہوا؟ اس لئے کہ "تھانہ بھون" میں کچھ دن گزار لئے تھے اور حضرت والا کی صحبت نصیب ہوگئی تھی، ورنہ آج کیا کسی کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ میں بتادوں کہ جس زبان میں تم باتیں کر رہے ہو، میں یہ زبان جانتا ہوں، آج اگر کوئی یہ بات بتائے گا بھی تو اپنا عِلم جتانے کے لئے بتائے گا کہ ہمیں جاہل مت سمجھنا، ہمیں بھی یہ زبان آتی ہے، اس لئے نہیں بتائے گا کہ کہیں تجسّس کے گناہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ بلکہ آجکل تو اس کو کمال سمجھا جائے گا کہ چپکے چپکے بات سنتے رہیں اور بعد میں اس کا اظہار کریں گے کہ تم نے تو ہم سے چھپانے کی کوشش کی، لیکن ہم کو سب پتہ چل گیا کہ آپ نے کیا کیا باتیں کیں۔

بات یہ ہے کہ ان سب باتوں کا خیال کرنا دین کا ایک حصّہ ہے، آج ہم نے ان کو دین سے خارج کر دیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ فکر عطا فرمادیں تو پھر یہ سب باتیں سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

تیرہویں مجلس
تکبر اور اس کا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تیرھویں مجلس

تکبّر اور اس کا علاج

الحمد لله رب العالمين ۔ والعاقبة للمتقين والصلاة والسلام على رسوله الكريم ۔ وعلى آله وأصحابه اجمعين ۔ وعلى كل من تبعهم باحسان إلى يوم الدين ۔ أمّا بعد!

کائنات کا سب سے پہلا گناہ

کبر، یعنی تکبّر بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس سے بہت سی باطنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو "امّ الامراض" کہا جاتا ہے۔ اور سب سے پہلا گناہ جو کائنات میں سرزد ہوا، وہ کبر کا گناہ تھا۔ جب اللہ جل شانہ نے ابلیس سے کہا کہ (حضرت) آدم کو سجدہ کرو، تو اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور دلیل یہ

دی کہ:

اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ

(سورۃ الاعراف، آیت ۱۲)

میں اس سے بہتر ہوں، اپنے کو اس ابلیس نے بڑا سمجھا اور حضرت آدم علیہ السلام کو چھوٹا سمجھا۔ اس کی دلیل بھی بہت مضبوط پیش کی کہ آپ نے ان کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آگ مٹی سے افضل ہے۔

اگر دلیل کی طرف دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ یہ دلیل بڑی قوی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نہ ماننے کے نتیجے میں کبر کا جو مظاہرہ ہوا، یہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی وہ نافرمانی تھی جو سب سے پہلے سرزد ہوئی، اور اسی تکبر کے نتیجے میں شیطان ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوا۔

"تکبر" تمام گناہوں کی جڑ ہے

اسی تکبر سے "حسد" پیدا ہوتا ہے، کیونکہ جب دل میں یہ خیال ہے کہ میں بڑا ہوں، اب اگر دوسرا آدمی اس سے آگے بڑھ گیا اور ترقی کر گیا تو دل میں یہ حسد پیدا ہوتا ہے کہ یہ آدمی کیوں آگے بڑھ گیا، مجھے آگے بڑھنا چاہئے تھا۔

اسی تکبر سے "بغض" پیدا ہوتا ہے، "غصہ" کی کثرت تکبر کی وجہ سے ہوتی ہے، "غیبت" کا گناہ عموماً تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، "تجسس" بھی تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، غرض یہ کہ "تکبر" بے شمار امراض کی جڑ ہے۔ جس طرح جسمانی امراض کے ماہرین اور اسپیشلسٹ ہوتے ہیں، کوئی کان کا اسپیشلسٹ ہے،

کوئی ناک کا اسپیشلسٹ ہے، کوئی حلق کا اسپیشلسٹ ہے، اسی طرح روحانی امراض کے اسپیشلسٹ بھی ہوتے ہیں، ان میں ایک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، وہ اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں فرماتے ہیں کہ یہ تکبر "ام الامراض" ہے، یعنی تمام بیماریوں کی ماں ہے۔ اگر یہ ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو دوسری بیماریاں اس سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لہٰذا اس بیماری کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس بیماری سے محفوظ فرمائے اور اگر یہ بیماری ہمارے اندر ہے تو اس کا علاج بھی فرمادے۔ آمین۔

کِبر کے معنی

"کِبر" کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا یعنی افضل سمجھنا، اگر کسی کی عمر ۳۰ سال ہے اور دوسرے کی عمر بیس سال ہے تو ظاہر ہے کہ تیس سال والا شخص اپنے آپ کو بیس سال والے سے عمر کے اعتبار سے بڑا سمجھے گا، یہ کِبر نہیں اور بری بات نہیں، اپنے آپ کو بڑا یعنی افضل سمجھنا کہ میں اس سے بہتر ہوں، میں اس سے اچھا ہوں، یہ کبر ہے۔

اور جب اپنی بڑائی دل میں ہوتی ہے تو پھر اپنے کسی انداز و ادا سے اس کا مظاہرہ بھی ہو جاتا ہے، مثلاً گفتگو سے، قول سے، فعل سے، اس کا نام ہے "تکبر" لہٰذا دوسرے کے مقابلے میں بڑائی جتلانا تکبر ہے۔ یہ فرق ہے "تکبر" اور "کِبر" میں۔ گویا کہ "کِبر" یہ ہے کہ دل میں اپنی بڑائی کا پیدا ہونا اور تکبر یہ ہے کہ دوسرے کے مقابلے میں اپنی بڑائی جتلانا، مثلاً دوسرے سے اس انداز سے گفتگو کرنا جس میں دوسرے کی تحقیر شامل ہو۔ یہ تکبر کبر کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کو ختم

کرنے کی ضرورت ہے۔

تکبر ایک مخفی بیماری ہے

یہ بیماری ایسی ہے کہ اکثر و بیشتر انسان کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ بیماری میرے اندر ہے یا نہیں۔ اور وہی بیماری سب سے زیادہ خطرناک ہے جو اندر ہی اندر بڑھتی چلی جائے، اور اس کا پتہ ہی نہ چلے، جیسے آج کل ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ سب سے خطرناک بیماری "کینسر" کی ہے، اس لئے کہ یہ بیماری ایسی ہے کہ جب انسان کے بدن میں پیدا ہو جاتی ہے تو اندر ہی اندر بڑھنے لگتی ہے، اس وقت نہ بیمار کو پتہ چلتا ہے، نہ ڈاکٹر کو پتہ چلتا ہے کہ اندر کیا ہو رہا ہے، کیونکہ جب بیماری میں انسان کو تکلیف ہوتی ہے اُس وقت پتہ چلتا ہے کہ میرے اندر یہ بیماری ہے۔ اس لئے بیماری کے اندر تکلیف کا ہونا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، کیونکہ تکلیف اس بات کا سگنل ہوتا ہے کہ اندر کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے، لہٰذا آدمی ڈاکٹر کے پاس اس کے علاج کے لئے جاتا ہے اور اپنا علاج کرالیتا ہے اور ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر بیماری تو اندر پیدا ہو گئی اور اس کی تکلیف نہیں ہوئی تو اب اس کے علاج کی طرف بھی دھیان نہیں جائے گا اور اس کے تدارک کی فکر نہیں ہو گی، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ بیماری اندر ہی اندر بڑھتی چلی جاتی ہے، اور انسان کو اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ ناقابل علاج ہو جاتی ہے اور اس کے بعد کوئی علاج ممکن نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

اسی طرح کبر کی بیماری بھی ایسی ہی ہے، آدمی اپنے آپ کو یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں، لیکن حقیقت میں وہ کبر اور تکبر کا شکار ہوتا ہے، اور یہ

بیماری اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ کبھی آپ نے یہ سنا کہ کسی متکبر نے یہ کہا ہو کہ میں تکبر کرتا ہوں، آج تک کسی نے یہ اقرار نہیں کیا۔

ٹخنوں سے نیچے شلوار لٹکانا

ایک بات ہمارے معاشرے میں بہت مشہور ہوگئی ہے، وہ یہ کہ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ، شلوار وغیرہ پہننے کی جو ممانعت حدیث شریف میں آئی ہے، اس کے بارے میں لوگوں نے یہ حیلہ نکالا ہے کہ حدیث شریف میں تو یہ آیا ہے کہ جو شخص تکبر کی وجہ سے پاجامہ یا شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکائے گا تو وہ حصہ جہنم میں جائے گا، اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ دیکھئے! اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی قید لگائی ہے، لہٰذا تکبر کی وجہ سے شلوار کو نیچے لٹکانا تو ناجائز ہے، لیکن اگر تکبر کے بغیر ویسے ہی فیشن کے طور پر لٹکالیا، یا اس لئے لٹکالیا کہ ہمیں اس طرح لٹکانا اچھا لگتا ہے تو پھر کوئی گناہ نہیں، اور ہم تکبر سے نہیں لٹکاتے۔ یہ بات لوگوں نے بہت زیادہ مشہور کر رکھی ہے۔ میرا یورپ اور امریکہ جانا ہوا تو دیکھا کہ وہاں کے مسلمانوں میں یہ بات بہت مشہور ہے اور جس سے بھی پوچھا جائے تو وہ یہی کہتا ہے کہ ہم یہ کام تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے۔

میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ اچھا تم مجھے کوئی ایک آدمی بھی ایسا دکھادو جو کہتا ہو کہ میں تکبر کی وجہ سے شلوار نیچے لٹکاتا ہوں۔ کوئی آدمی ایسا ملے گا؟ نہیں ملے گا، کیونکہ تکبر ایسی چیز ہے کہ اگر متکبر کو پتہ چل جائے کہ میں تکبر کرتا ہوں تو بس تکبر ختم ہو جائے۔ تکبر تو پیدا ہی اس طرح ہوتا ہے کہ جس شخص کے اندر تکبر ہے اس کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ میں کبر اور تکبر کے اندر مبتلا ہوں۔ یہ شیطان

کا دھوکہ ہے کہ آدمی یہ کہے کہ میں یہ کام تکبر کی وجہ سے نہیں کرتا ہوں، لہٰذا میرے لئے یہ عمل جائز ہے۔

حضور ﷺ کے ازار کی کیفیت

حالانکہ دنیا میں کسی شخص کے بارے میں یہ گارنٹی نہیں ہے کہ وہ تکبر سے پاک ہوگا، سوائے حضور اقدس نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے، آپ کے بارے میں یہ گارنٹی ہے کہ آپ ﷺ تکبر سے پاک تھے، اب جس ذات اقدس کے بارے میں یہ گارنٹی ہے کہ وہ تکبر سے پاک تھے، وہ تو اپنا ازار ٹخنوں سے نیچے نہیں لٹکاتے بلکہ آپ اپنا ازار نصف ساق تک رکھتے تھے، کیونکہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانا تکبر والا کام ہے، اور ہم لوگ جن کے اندر تکبر پیدا ہونے کا ہر وقت خطرہ ہے، لیکن ازار نیچے لٹکا کر یہ کہتے ہیں کہ ہم تکبر سے نہیں لٹکاتے، اس سے زیادہ شیطان کا دھوکہ اور کیا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ تکبر ایک ایسا امر مخفی ہے کہ متکبر کو پتہ نہیں لگتا کہ میں تکبر کر رہا ہوں۔

ظاہری تواضع میں مخفی تکبر

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک آدمی ایسا کام کر رہا ہوتا ہے جو بظاہر تواضع کا ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ سراسر تکبر ہوتا ہے۔ جیسے آج کل یہ رواج ہے کہ لوگ اپنے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ میں بالکل ناکارہ ہوں، میں گیا گزرا جاہل ہوں۔ اب یہ الفاظ تو بظاہر تواضع کے ہیں کہ وہ شخص اپنے آپ کو ناکارہ اور جاہل کہہ رہا ہے، لیکن بسا اوقات یہ سراسر تکبر ہوتا

ہے، کیونکہ وہ شخص یہ الفاظ اس لئے کہتا ہے تاکہ سامنے والا پلٹ کر یہ کہے کہ جناب! آپ جاہل کہاں، آپ تو بہت بڑے علامہ ہیں۔ اس کا آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں، وہ اس طرح کہ جو شخص اپنے آپ کو یہ کہہ رہا ہے کہ میں جاہل ہوں، میں ناکارہ ہوں، اس کے جواب میں کوئی دوسرا شخص یہ کہدے کہ بیشک آپ جاہل اور ناکارہ ہیں، بس اس وقت اس کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ سچے دل سے یہ الفاظ نہیں کہہ رہا تھا بلکہ اس لئے کہہ رہا تھا تاکہ سامنے والا پلٹ کر اس کے لئے تعریفی کلمات کہے، یہ تواضع نہیں بلکہ تکبر ہے۔

لہٰذا یہ تکبر بڑا دقیق اور باریک ہوتا ہے، اس کے وجود کا پتہ نہیں چلتا، اس لئے کسی معالج کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ پہچان کر بتائے کہ اس کے اندر تکبر ہے۔

بظاہر تکبر حقیقت میں تکبر نہیں

بعض اوقات بظاہر دیکھنے میں تکبر نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں نہیں ہوتا، جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انا سید ولد آدم ولا فخر

میں آدم کے تمام بیٹوں کا سردار ہوں

یہ کون کہہ رہا ہے؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم، اگر کوئی دوسرا آدمی یہ بات کہے تو یہ اس کے حق میں بڑائی کا جملہ ہے۔ لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، لیکن یہ بات کسی فخر اور تکبر کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرتے

ہوئے کہہ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے آدم کے بیٹوں کی سرداری عطا فرمائی ہے۔ اب ظاہر میں یہ الفاظ بڑائی کے ہیں، حقیقت میں بڑائی نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا تعریف پر ہنسنا

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ، بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص ان کے پاس آکر ان کی تعریف کرتا کہ حضرت! آپ نے بڑا اچھا وعظ فرمایا، فلاں بات بڑی اچھی ارشاد فرمائی، تو وہ بہت خوش ہوتے اور ہنستے تھے، اب دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ یہ بزرگ اپنی تعریف سن کر خوش ہو رہے ہیں، اور جس شخص کے دل میں عجب اور کبر ہوتا ہے اس کی تو خواہش ہی یہ ہوتی ہے کہ دوسرا آدمی میری تعریف کرے اور تعریف سن کر اس کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ کسی شخص نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! آپ کو اپنی تعریف سن کر بڑا مزہ آتا ہے، کیونکہ جب کوئی آپ کے کسی کام کی تعریف کرتا ہے تو آپ بہت خوش ہوتے ہیں۔ حضرت نے جواب میں فرمایا، ہاں بھائی! میں بہت خوش ہوتا ہوں، اس لئے کہ کوئی شخص میرے کسی عمل کی تعریف کرتا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا تو کوئی عمل نہیں ہے، وہ تو میرے اللہ نے مجھے توفیق دی تو میں نے وہ عمل کر لیا، تو درحقیقت میرے اللہ کی تعریف ہوتی ہے، اور میں اللہ کی تعریف پر خوش ہوتا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھ سے یہ کام کرا دیا اور مجھے اس کام کی توفیق عطا فرما دی، میں اس پر خوش ہوتا ہوں۔ اب دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ صاحب عجب اور کبر

میں مبتلا ہیں، لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کے شکر کے مقام پر ہیں۔

لہٰذا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تکبر کی بیماری ہوتی ہے، لیکن انسان کو پتہ نہیں لگتا، اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دیکھنے میں بیماری معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں بیماری نہیں ہوتی۔ اس لئے صرف یہ کہدینا کہ ہمارے اندر تکبر نہیں ہے، اس سے بات نہیں بنتی، اس لئے کہ جب تمہارے اندر تکبر ہوگا تو تمہیں پتہ بھی نہیں ہوگا کہ تمہارے اندر تکبر ہے یا نہیں۔

متکبر کی بہترین مثال

کسی نے عربی زبان میں متکبر کی ایک بہت اچھی مثال بیان کی ہے، کہ متکبر کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو اور نیچے کی طرف دیکھ رہا ہو، اب نیچے جو لوگ اس کو نظر آرہے ہیں، وہ ان سب کو چھوٹا سمجھتا ہے، کیونکہ وہ سب اس کو چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں، اور نیچے والے اس کو چھوٹا دیکھتے ہیں، اس لئے وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ دوسروں کو چھوٹا سمجھتا ہے اور دوسرے اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس متکبر کو اپنے تکبر کا پتہ نہیں ہے، لہٰذا اپنے آپ کو ان سے افضل سمجھ کر ان کو چھوٹا سمجھ رہا ہے، اور دوسرے لوگ جن کو یہ معلوم ہے کہ یہ متکبر ہے، وہ چاہے منہ پر اس کی تعریف کریں، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بیوقوف آدمی ہے اور تکبر کے اندر مبتلا ہے۔ اس لئے معالج کے بغیر تکبر کا پتہ نہیں چلتا۔ لہٰذا یہ دھوکہ مت کھانا کہ ہم تو تکبر........ کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے ازار نہیں کرتے، کیونکہ ازار کو نیچے کرنا ہی .... تکبر پیدا کرنے کا

ایک سبب ہے، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔

تکبر کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ ملفوظات ہیں۔ ان کی مختصر تشریح عرض کرتا ہوں۔

عالم کا اپنے کو جاہل سے اچھا سمجھنے کا علاج

ایک صاحب نے حضرت والا سے پوچھا کہ:

"اکثر بلا قصد یہ خیال آتا ہے کہ فلاں جاہل ہے، میں عالم ہوں، میں اس سے اچھا ہوں"

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے واقعۃً علم عطا فرمایا ہے، عالم ہے، اور دوسرا شخص عالم نہیں ہے، اب اس عالم کو یہ خیال آہی جاتا ہے کہ مجھے الحمدللہ علم حاصل ہے جو دوسرے کو حاصل نہیں ہے، اور علم جہل سے اچھا ہے، اس لئے اپنے اچھے ہونے کا خیال دل میں آگیا۔ آیا یہ خیال تکبر ہے یا نہیں؟ حضرت والا نے جواب دیا کہ:

نفس سے کہے کہ کیا معلوم خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے، ممکن ہے کہ اس کا باطن اچھا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑا ذلیل و خوار ہوں، اور خدا تعالیٰ نے تجھ کو دو چار حرف ظاہری سکھلا دیے ہیں، اس لئے تو بڑائی کرتا ہے، اگر وہ چاہے تو آج چھین لے تو کیا

کرے گا، اسی کا استحضار بہ تکرار کرے اور دعا بھی کرے۔
(ایضاً)

ایک اشکال

یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہئے، بعض اوقات دل میں یہ خیال آتا ہے کہ آدمی کسی حقیقت سے تو انکار نہیں کرسکتا، اگر ایک آدمی کے پاس علم ہے اور دوسرے کے پاس وہ علم نہیں ہے، اب جس کے پاس علم ہے وہ یہ کیسے کہدے کہ میرے پاس علم نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ علم جہل کے مقابلے میں بہتر ہے، قرآن کریم کی آیت ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
(سورۃ الزمر، آیت ۹)

یعنی علم رکھنے والا بہتر ہے اس کے بنسبت جو علم نہیں رکھتا۔ لہٰذا جس کے پاس علم ہے وہ کیسے جھٹلادے کہ میرے اندر یہ وصف نہیں ہے۔ یا مثلاً ایک آدمی زیادہ صحت مند ہے، اس کے مقابلے میں دوسرا آدمی کمزور ہے، اب ظاہر ہے کہ صحت مند یہ سوچے گا کہ اس کے مقابلے میں میری صحت اچھی ہے، میں اس کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہوں، مضبوط ہوں۔

یا مثلاً ایک آدمی کے پاس پیسہ زیادہ ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرے آدمی کے پاس پیسہ نہیں ہے، تو وہ یہ خیال کرے گا کہ میں اس کے مقابلے میں مالدار ہوں، اس کے پاس پیسہ نہیں ہے، میرے پاس پیسہ ہے۔ یا ایک آدمی بڑا افسر ہے، کسی بڑے عہدے پر فائز ہے، دوسرا آدمی چپراسی اور مزدور ہے، تو

بڑے منصب اور عہدے والا اپنے آپ کو اس چپراسی سے بڑا سمجھے گا یا نہیں؟ اب اگر وہ اپنے کو بڑا سمجھے تو تکبر ہو گیا، اور اگر بڑا نہ سمجھے تو جھوٹ ہو گیا، مثلاً اگر وہ یہ سمجھے کہ میں افسر نہیں ہوں، بلکہ میں تو ایک مزدور ہوں، یہ تو بالکل جھوٹ ہو گیا، یا مثلاً ایک آدمی طاقتور ہے، صحت مند ہے، وہ یہ کہے کہ میں طاقت ور نہیں ہوں، بلکہ میں کمزور ہوں، یا مثلاً ایک عالم ہے، وہ یہ کہے کہ میں عالم نہیں ہوں، بلکہ جاہل ہوں، یہ تو جھوٹ ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں باتوں کے درمیان کیسے تطبیق ہو گی کہ تکبر بھی نہ ہو اور جھوٹ بھی نہ ہو؟

اس اشکال کا جواب

ایک اور جگہ پر حضرت والا نے ایک اور جملہ ارشاد فرمایا ہے، اس کو یاد رکھنا چاہئے، اس سے یہ مسئلہ آسان ہو جاتا ہے وہ یہ کہ:

"اپنے آپ کو اکمل سمجھنا تکبر نہیں، افضل سمجھنا تکبر ہے۔"

اکمل سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ دوسرے کے پاس بظاہر علم کم ہے اور میرے پاس علم زیادہ ہے، اس کی صحت اچھی نہیں ہے اور میری صحت اچھی ہے، اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس الحمد للہ اتنے پیسے ہیں، اس کے پاس چھوٹا مکان ہے اور میرے پاس بڑا مکان ہے، اس کی اولاد کم ہے اور میری اولاد زیادہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں مقدار کے اعتبار سے اپنے آپ کو زیادہ سمجھنا تکبر نہیں۔ البتہ افضل سمجھنا کہ میں اس سے افضل ہوں، یہ تکبر ہے۔ اور اس کا علاج حضرت والا نے یہ بتا دیا کہ آدمی یہ سوچے کہ کیا

معلوم خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے۔

اس نعمت پر شکر ادا کرے

یہ جو اوپر بیان کیا کہ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں اکمل سمجھنا اور علم میں زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، یا عمر میں زیادہ سمجھنا، یا صحت میں زیادہ سمجھنا، یا مال میں زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، اس میں بھی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ دل میں جس زیادتی کا خیال آ رہا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اور یہ کہے کہ یہ زیادتی میری قوت بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ جل جلالہ کی عطا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی عطا کا تصور کرے گا تو اس سے تکبر پیدا نہیں ہو گا۔

افضل سمجھنا بے بنیاد ہے

اور اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھنا بالکل بے بنیاد ہے، کیا معلوم کہ آخر میں جا کر کیا انجام ہونا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں کون مقرب ہے اور کون مقرب نہیں ہے، نہ وہاں علم کی بڑائی کام آئے گی، نہ عمر کی بڑائی کام آئے گی، نہ وہاں مال و دولت کی کثرت کام آئے گی، نہ اس کی گارنٹی ہے کہ جس کے پاس علم زیادہ ہے وہ ضرور افضل ہو گا، جبکہ حدیث شریف میں ہے کہ سب سے پہلے جہنم جس کے ذریعہ سلگائی جائے گی وہ ایک عالم ہو گا۔ لہٰذا صرف علم کے بھروسے پر یا اس بنا پر کہ لوگ دنیا میں میرے ہاتھ چومتے ہیں، یا مجھے بڑا سمجھتے ہیں، یا علامہ سمجھتے ہیں، میں افضل ہوں، یاد رکھیے! اس پر کوئی بھروسہ نہیں ہے، جب حساب کتاب کا منظر سامنے ہو گا تو بڑے بڑے علامہ دھرے رہ جائیں گے، لہٰذا علم کی

وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے۔

اسی طرح مال کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے، جبکہ قیامت کے دن بڑے بڑے مالدار جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ لہٰذا جب کسی بات کا بھروسہ نہیں تو پھر کس بنیاد پر آدمی اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ایک آدمی نے ان سے یہ کہدیا کہ تم تو میرے کتے سے بدتر ہو۔ ان بزرگ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ابھی میرا کچھ پتہ نہیں کہ میں کتے سے بدتر ہوں یا نہیں، جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور وہاں پر میں حساب کتاب کے مرحلے کو پار کر گیا تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کتے سے افضل ہوں، اور اگر میں وہاں حساب کتاب کے مرحلے سے نہ گزر پایا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہو گیا تو پھر بیشک تم ٹھیک کہتے ہو کہ میں کتے سے بدتر ہوں، اس لئے کہ کم از کم اس کتے کو حساب کتاب نہیں دینا پڑے گا اور اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سامنا نہیں ہوگا۔

یہ خیال دل سے نکال دو

یہ ہیں حقیقی معنی میں اللہ والے، دوسرا شخص گالی دے رہا ہے، لیکن یہ اپنے حقائق اور معارف میں گم ہیں، اور اپنی حقیقت حال کو دیکھ رہے ہیں کہ میری حقیقت تو یہ ہے۔ لہٰذا دماغ سے افضل ہونے کا خیال نکال دو، نفس سے کہے کہ تمہیں کیا معلوم کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے، ممکن ہے کہ اس کا باطن اچھا

ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑا ذلیل و خوار ہوں، اور خدا تعالیٰ نے تجھ کو دو چار حرف ظاہری سکھا دیے ہیں، اس لئے تو بڑائی کرتا ہے، اگر وہ چاہے تو آج چھین لے۔ کس چیز پر تو اکڑتا ہے اور اتراتا ہے؟ کیا یہ علم تجھے ماں کے پیٹ سے حاصل ہو گیا تھا؟ کسی نے اپنے فضل و کرم سے عطا فرما دیا، اور جس نے عطا فرمایا ہے وہ جب چاہے سلب کر لے، جب چاہے واپس لے لے۔

کیا تو مال پر اکڑتا ہے، کیا یہ مال تجھے ماں کے پیٹ سے ملا تھا؟ کسی دینے والے نے مال دیا ہے، اور جس نے دیا ہے وہ جب چاہے واپس لے لے۔ کیا تو صحت پر اکڑتا ہے؟ بڑے بڑے تندرست اور توانا لوگ ایسے گزرے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے صحت واپس لی تو وہ بتاشے کی طرح پچک گئے۔

سبق آموز واقعہ

ہمارے ایک عزیز تھے، جن کا ابھی ایک دو سال پہلے انتقال ہوا۔ ان کے بارے میں سارے دیوبند میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ برف کی سلی کو مکّہ مار کر توڑ دیتے تھے، اتنے طاقت ور تھے، انہوں نے کبھی بھی زندگی میں تربوز کو چاقو سے نہیں کاٹا، بس مکہ مارا اور توڑ دیا، اور اس کے ساتھ ساتھ بڑے عابد و زاہد آدمی تھے۔ بعد میں لاہور میں مقیم ہو گئے تھے، چار پانچ سال پہلے لاہور میں ان سے ملاقات کے لئے گیا تو دیکھا کہ کھانا کھانے کے لئے ہاتھ منہ تک نہیں اٹھ رہا تھا، دوسرے لوگ کھانا کھلا رہے تھے، جب میں ان کے پاس پہنچا تو مجھے دیکھ کر رو پڑے، اور کہنے لگے کہ یہ وہی "حامد" ہے جو برف کی سلی مکے سے توڑ دیا کرتا تھا، اور اب یہ حال ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھا سکتا۔

تم کس بات پر اتراتے ہو؟

ارے تم کس بات پر اتراتے ہو؟ صحت پر اتراتے ہو؟ قوت پر اتراتے ہو؟ کیا مال پر اتراتے ہو؟ کیا علم پر اتراتے ہو؟ ارے ان میں سے کوئی چیز ایسی ہے جس کی ہمیشہ تمہارے پاس رہنے کی گارنٹی ہو؟ بلکہ کسی دینے والے نے دی ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے؟ اس لئے یہ دو چار حرف اس نے سکھا دئے ہیں، وہ اگر آج چھین لے تو تم کیا کرلو گے؟ بس اس کا استحضار اور تکرار کیا جائے، جب کبھی دل میں بڑائی کا خیال آئے، بس اس کا دھیان کرلے کہ کسی دینے والے نے یہ وصف اپنے فضل سے دیا ہے، اپنے انعام سے دیا ہے، تیرا کوئی استحقاق نہیں تھا، کتنے لوگ ہم میں ایسے ہیں جو جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، اور جس طرح دیا ہے وہ اسی طرح واپس بھی لے سکتا ہے۔ لہٰذا تیرے لئے اترانے اور اکڑنے کا اور دوسروں پر بڑائی جتلانے کا اور اپنے آپ کو افضل سمجھنے کا کوئی موقع نہیں، ہاں، شکر کا موقع ہے کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، میں اس کا مستحق نہیں تھا، اور میرے قبضہ قدرت میں نہیں تھا، آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمائی، اے اللہ! آپ کا شکر ہے۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ

"شکر" بے شمار بیماریوں کا علاج

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شکر ایسی چیز ہے کہ یہ بیشمار روحانی بیماریوں کا علاج ہے، جو آدمی شکر کرے گا، وہ کبھی تکبر

میں مبتلا نہیں ہوگا، انشاء اللہ۔ اس لئے کہ شکر کے معنی کیا ہیں؟ شکر کے معنی یہ ہیں کہ یہ نعمت جو مجھے ملی ہوئی ہے، میں اس کے لائق نہیں تھا، میں اس کا مستحق نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دی ہے، اس کا شکر و احسان ہے۔

قرض کی ادائیگی شکر کا موقع نہیں

شکر کب کیا جاتا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنا فریضہ ادا کرے یا قرضہ ادا کرے، تو کیا قرض خواہ کے ذمے شکر ادا کرنا واجب ہے؟ نہیں، مثلاً ایک آدمی مجھ سے ایک ہزار روپے قرض لے گیا، اور یہ کہا کہ دو مہینے بعد واپس کروں گا، یہ احسان تو میں نے کیا کہ میں نے ایک ہزار روپے بطور قرض دیے، اس کو چاہئے کہ میرا شکریہ ادا کرے، پھر جب دو ماہ بعد وہ ایک ہزار روپے مجھے واپس لا کر دے گا، تب بھی احسان دینے والے کا رہا کہ اس نے ایک ہزار روپے دیے تھے اور دو ماہ تک اس ہزار روپے سے اپنے آپ کو محروم رکھا، لہٰذا وہ قرض دار جب واپس لا کر دے رہا ہے تو وہ کوئی احسان نہیں کر رہا ہے، لہٰذا وہ شکریہ کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔

شکر کا موقع یہ ہے

شکریہ اس وقت ادا کیا جاتا ہے جب آدمی اپنے فریضہ سے زیادہ کام کرے، مثلاً ایک ہزار روپے دوسرے کے ذمے واجب تھے، واپس کرتے وقت اس نے ایک ہزار کے بجائے بارہ سو روپے اپنی طرف سے خوش دلی کے ساتھ واپس کر دیے، چونکہ اس نے زیادہ دے کر احسان کیا، لہٰذا اس کا شکریہ واجب

ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذمّے یہ کام ضروری اور واجب نہیں تھا، اور میں اسکا مستحق تو نہیں تھا لیکن اللہ جل جلالہ نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی۔ لہٰذا شکر کے اندر خود یہ اعتراف پنہاں ہے کہ میں اس کے لائق نہیں تھا، اور جو شخص لائق نہ ہونے کا اعتراف کرے کیا وہ تکبر میں مبتلا ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا، اس لئے جب بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت ملے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، انشاء اللہ تکبر کی جڑ کٹتی جائے گی۔

شیطان کے داؤ سے بچنے کا طریقہ

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جب شیطان راندۂ درگاہ ہو گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے کہا:

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ○

(سورۃ الاعراف، آیت ۱۷)

چونکہ ابن آدم نے مجھے تباہ کیا ہے، اس لئے اس کا بدلہ لینے کے لئے اس کے پاس دائیں سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا، اور ابن آدم کو گمراہ کروں گا۔ (آخر میں کہتا ہے کہ) آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔

ہمارے حضرت والا فرماتے تھے کہ شیطان چونکہ بڑا خرّانٹ ہے، اس کو یہ معلوم ہے کہ جو آدمی شکر کرنے والا ہوگا، اس کے سامنے میری نہیں چلے گی، اس پر میرا داؤ نہیں چلے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا ہو، اس پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔

عین پریشانی میں نعمتوں کو یاد کرو

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی جو نعمت حاصل ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور ایک وقت میں صرف ایک نعمت نہیں ہے بلکہ ہر لمحے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش برس رہی ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا

(سورۂ ابراہیم، آیت ۳۴)

اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو شمار نہیں کرسکو گے۔

انسان چونکہ ناشکرا ہے، اس لئے اگر ذرا سی کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے یا پریشانی آجاتی ہے تو اس کو ہر وقت گاتا رہتا ہے، اور عین اس تکلیف اور پریشانی کے وقت میں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں متوجہ اور مبذول ہیں، ان کا کوئی ذکر نہیں، ان کی طرف ذرا سا دھیان نہیں، ورنہ عین تکلیف اور پریشانی کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی اتنی نعمتیں ہماری طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ ہم ان کا شمار نہیں کرسکتے۔

''شکر'' کا ایک انوکھا انداز

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک نانا تھے، حضرت والا کی تربیت میں ان کو بھی بڑا دخل رہا ہے، بڑے فاضل اور بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں بچپن میں رات کو سونے کے وقت ان کو دیکھتا تو مجھے عجیب نظر آتا تھا، وہ یہ کہ میرے نانا رات کو سونے کے وقت بستر پر بیٹھ جاتے اور بڑے والہانہ انداز میں پڑھنا شروع کر دیتے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ
وَ لَکَ الشُّکْرُ۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

مسلسل جھوم جھوم کر کافی دیر تک یہ پڑھتے رہتے۔ جب میں نے کچھ ہوش سنبھالا تو میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ یہ رات کو سونے سے پہلے آپ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ سارا دن تو غفلت میں گزر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں ہوتا، اس لئے میں رات کو سونے سے پہلے بستر پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں۔ یا اللہ! آپ نے یہ مکان عطا فرمایا:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے صحت عطا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے رزق عطا فرمایا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے یہ آرام دہ بستر عطا فرمایا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے عافیت عطا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے بیوی عطا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے بچے عطا فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں تاکہ ان نعمتوں کے شکر کا ہزارواں یا لاکھواں حصہ زبان سے ادا ہو جائے۔

سونے سے پہلے شکر ادا کرلو

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ تم بھی ایسا ہی کیا کرو، رات کو سونے سے پہلے تمام نعمتوں کا شکر ادا کرلیا کرو۔ ذرا سا دھیان کرو گے تو سینکڑوں نعمتوں کا استحضار ہو جائے گا۔ ارے صرف ایک نعمت کو سوچنا شروع کرو گے تو وہ بھی اتنی زیادہ نظر آئے گی کہ ساری عمر بھی سجدے میں پڑے رہو گے تب بھی اس ایک نعمت کا شکر ادا نہیں ہوگا۔ یہ دو آنکھیں اللہ تعالیٰ نے دی ہیں، ایک آنکھ کو لے لو اور اس کے بارے میں سوچو کہ یہ کیسی نعمت ہے؟ ذرا سا اس میں بال آجائے تب اندازہ ہوگا کہ کیسی نعمت ہے، اسی ایک نعمت کو سوچنا شروع کردو گے تو حق شکر ادا نہیں ہو سکے گا۔

تکبر سے بچنے کا ایک چٹکلہ

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میاں! یہ تکبر بڑی خراب چیز ہے، بڑے بڑے معالجوں کو چکر دیدیتی ہے، اس کا علاج کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن میں تمہیں ایک چٹکلہ بتا رہا ہوں، اس چٹکلے پر عمل کرلو تو انشاء اللہ پھر اس تکبر کی بیماری میں مبتلا ہی نہیں ہو گے، اور اگر ہو گئے تو انشاء اللہ جلدی نکل جاؤ گے، وہ چٹکلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، ہر وقت، ہر لمحے، چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کے شکر کی رٹ لگاؤ، موسم اچھا ہے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

ہوا چل رہی ہے،

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

جو اچھی بات سامنے آئے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، جتنا جتنا شکر ادا کرو گے، انشاء اللہ تکبر سے اتنی ہی حفاظت رہے گی۔ کہنے کو تو یہ چھوٹا سا چٹکلہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑے کانٹے کی بات ہے، اور عمل کرنا بھی اس پر مشکل نہیں، صرف دھیان کرنے اور مشق کرنے کی بات ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

چودہویں مجلس

تکبر کی اقسام

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

چودھویں مجلس

الحمد لله رب العالمين ۔ والعاقبة للمتقين ۔
والصلاة والسلام على رسوله الكريم ۔ وعلى آله
وأصحابه اجمعين ۔ أمّا بعد!

کبر کی اقسام

فرمایا کہ:

اقسام کبر کے اس کثرت سے ہیں کہ لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی۔
اور اکثر ان میں ادق اور اغمض اس قدر ہیں کہ بجز محقق کے
کسی کی بھی نظر وہاں نہیں پہنچتی، اور اس میں علماء ظاہر کو
بھی اس محقق کی تقلید بلا تفحص حقیقت کرنا پڑتی ہے۔

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ کبر کی بیماری ایسی ہے کہ خود بیمار کو پتہ نہیں ہوتا کہ میں اس بیماری میں مبتلا ہوں اور کبر کی بعض قسمیں اتنی دقیق اور باریک ہیں کہ اکثر اوقات بیمار کو اس کا پتہ نہیں چلتا، ایسا شیخ جو محقق بھی ہو، وہی

پتا لگتا ہے کہ اس کو یہ بیماری ہے یا نہیں ہے، اور اس بیماری کا علاج کیا ہے؟

کبر کے مختلف علاج

ایک مثال کے ذریعہ اس کو سمجھئے! وہ یہ کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں یہ معمول تھا کہ جب کوئی شخص اپنی اصلاح کرانے کے لئے آتا تو "کبر" کا علاج سب سے پہلے کیا جاتا تھا، حضرت والا مختلف لوگوں کے لئے مختلف علاج تجویز فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً کسی کے اندر دیکھا کہ اس کے اندر "تکبر" ہے تو آپ نے اس سے فرمایا کہ تم ہر نماز کے بعد مسجد میں یہ اعلان کیا کرو کہ: بھائیو! میرے اندر تکبر کی بیماری ہے، میرے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نجات عطا فرمائے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک متکبر آدمی جس کے دل میں تکبر اور اپنی بڑائی ہے، اس کو جب بھرے مجمع میں یہ اعلان کرنا پڑے کہ میرے اندر تکبر ہے تو اس اعلان کے نتیجے میں اس کے دل پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ لیکن جب شیخ کے حکم سے کرتا ہے تو دل پر اتنی زور کی ضرب پڑتی ہے کہ وہ سارا تکبر ختم ہو جاتا ہے۔

یا مثلاً کسی متکبر کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو۔ ہر ایک کو مختلف علاج بتائے، کیونکہ ہر آدمی کے لئے ایک علاج نہیں ہوتا، چونکہ بیماریاں مختلف ہوتی ہیں، ان کے انداز مختلف ہوتے ہیں، اسباب مختلف ہوتے ہیں، حالات مختلف ہوتے ہیں، اس لئے ایسا نہیں ہے کہ ایک علاج سب کے لئے تجویز کر دو، جیسے حکیم صاحب نے ایک ہی جوشاندہ سب کے لئے تجویز کر دیا۔ یا کوئی شخص یہ سوچے کہ چونکہ حضرت والا نے فلاں شخص کو فلاں

بیماری میں یہ علاج تجویز کیا تھا، لہٰذا میں بھی وہی علاج کرلوں، یہ ٹھیک نہیں ہے، بلکہ شیخ دیکھتا ہے کہ اس کے لئے کیا مناسب ہے۔

خود اپنا علاج کرنا

ایک صاحب نے یہ دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فلاں شخص کو یہ علاج بتایا ہے کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو، اب بجائے اس کے کہ اپنے علاج کے لئے خود رجوع کرتے اور اپنے لئے علاج تجویز کراتے، ان صاحب کو دیکھ کر خود اپنا علاج شروع کر دیا اور نمازیوں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دیے۔ حضرت کو پتہ چلا کہ فلاں صاحب نے خود سے یہ کام شروع کر دیا ہے، آپ نے اس کو بلایا، اور اس سے فرمایا کہ اس طرح علاج نہیں ہوا کرتا، اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے اس طرح لوگوں کے جوتے سیدھے کرنے سے تمہارے تکبر میں اور زیادہ اضافہ ہوگا، اس تکبر میں کمی نہیں ہوگی، اس لئے کہ دماغ میں شیطان یہ بات بٹھائے گا کہ دیکھ تو کتنا متواضع ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی خود اپنے تکبر کا علاج کرنے بیٹھ جائے، بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس کو یہ علم عطا کیا ہو، وہی یہ کام کر سکتا ہے۔

کسی شیخ سے تربیت حاصل کرنا

عام طور پر یہ علم عطا نہیں ہوتا جب تک اس نے اپنے آپ کو پامال نہ کیا ہو، شیخ تھوڑے رگڑے دیتا ہے، اس رگڑے کھانے کے نتیجے میں وہ کبر دل سے نکلتا ہے اور اس وقت حقیقت کھلتی ہے کہ کس کبر کا کیسے علاج کیا جائے۔ ہمارے

یہ جتنے بزرگ جن کا نام لے کر ہم زندہ ہیں: حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، یہ حضرات رگڑے کھائے ہوئے تھے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو خود ساختہ پیر بن کر بیٹھ گیا ہو، بلکہ ان سب نے رگڑے کھائے تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوھیؒ کا واقعہ

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوھی قدس اللہ سرہ جب نئے نئے درس نظامی سے فارغ ہوئے اور عالم بن گئے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ علم تکبر پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے کہ عالم بننے کے بعد دماغ میں یہ بات آجاتی ہے کہ میں نے بہت کچھ پڑھ لیا، مجھے بہت کچھ آتا ہے۔ بہرحال، حضرت مولانا رشید احمد گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ، یہ ہمارے تمہارے جیسے عالم نہیں تھے کہ بس کچے پکے پڑھ کر عالم بن گئے بلکہ ان کی استعداد بڑی پختہ تھی۔ اس وقت تھانہ بھون کی خانقاہ میں تین بزرگ بیٹھتے تھے، ایک حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، دوسرے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور تیسرے حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ، ان کو "اقطاب ثلاثہ" کہا جاتا ہے، یہ تین اولیاء اللہ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم تھے، ان کا ایک رسالہ حضرت گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر سے گزرا، اس رسالے میں کوئی ایسی بات لکھی ہوئی تھی جو

علمی طور پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو صحیح معلوم نہیں ہو رہی تھی، چنانچہ انہوں نے ارادہ کیا کہ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب سے اس مسئلہ پر مناظرہ کروں۔ چنانچہ مناظرہ کی نیت سے گنگوہ سے تھانہ بھون کی طرف روانہ ہوئے۔

جب تھانہ بھون پہنچے تو چونکہ پہلے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، اور حضرت حاجی صاحب سے پہلے سے شناسائی تھی، اس لئے سلام کرنے کے لئے حاجی صاحب کے پاس رکے، حضرت حاجی صاحب نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ کہا کہ شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جا رہا ہوں، کیوں جا رہے ہو؟ ان سے مناظرہ کرنا ہے، توبہ توبہ، وہ اتنے بڑے عالم، اور تم ابھی نئے فارغ ہوئے ہو، اور ابھی ابھی مولوی بنے ہو، اور اتنے بڑے عالم سے مناظرہ کرنے جا رہے ہو، جو اللہ والے بھی ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے عرض کیا کہ حضرت! انہوں نے ایک رسالے کے اندر ایسی غلط بات لکھ دی ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا کو ٹھنڈا کیا، اور اسی ٹھنڈا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی کایا پلٹ دی، حاجی صاحب کی ان پر ایسی نظر پڑی کہ مناظرہ کرنے کا جو ارادہ تھا وہ تو ختم کر دیا، اور وہیں حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت ہو گئے۔

تمہیں سب کچھ دیدیا

پھر چالیس دن وہاں رہے، حالانکہ جب گنگوہ سے چلے تھے تو اس خیال سے چلے تھے کہ تھوڑی دیر بعد واپس آ جاؤں گا، اس لئے کوئی کپڑے وغیرہ بھی

ساتھ نہیں لئے تھے، بلکہ جو جوڑا پہن کر آئے تھے، اسی کو دھو کر سکھا کر دوبارہ پہن لیتے، اس طرح چالیس دن وہاں گزار دیے۔ اس قیام کے دوران حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب رگڑے کھلائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب چالیس دن کے بعد واپس جانے لگے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ:

"میاں رشید احمد: جو کچھ میرے پاس امانت تھی، وہ ساری میں نے تمہارے حوالے کر دی۔"

یہ کوئی معمولی مقام ہے کہ شیخ یہ کہے کہ جو کچھ میرے پاس تھا، وہ سب کچھ میں نے چالیس دن میں تمہیں دیدیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ مقام عطا فرمایا تھا۔

حضرت گنگوہیؒ کی عجیب حالت

پھر جب آپ واپس گنگوہ پہنچے تو ایک عرصے تک عجیب استغراق کی حالت طاری رہی، حتیٰ کہ بہت عرصے تک حضرت حاجی صاحب کو خط بھی نہیں لکھا، تو حضرت حاجی صاحب نے خود خط لکھا کہ:

"مدّت سے آں عزیز کی خیریت معلوم نہیں ہوئی، کس حالت میں ہیں، خط کے ذریعہ اپنے حالات سے مطلع کریں۔"

اب دیکھئے! یہ خط شیخ اپنے مرید کو لکھ رہا ہے۔ جواب میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ:

حضرت! بہت دن سے خط نہیں لکھ سکا، کوتاہی رہی، لیکن

اس لئے نہیں لکھا کہ اپنی حالت لکھتے ہوئے شرم معلوم ہوتی تھی کہ کیا اپنا حال لکھوں، آپ سے تعلق بھی ہوگیا، اس کے باوجود اپنی بے حالی کو کیا لکھوں۔ اس لئے شرم معلوم ہوتی تھی، البتہ آپ کی دعاؤں اور توجہ سے اتنا فرق ضرور معلوم ہوتا ہے کہ:

﴿۱﴾...... شریعت طبیعت بن گئی ہے۔

یعنی جس طرح انسان کے اندر طبعی تقاضے بھوک اور پیاس کے ہوتے ہیں اور جب تک انسان ان تقاضوں کو پورا نہ کرلے، انسان کو اس وقت تک چین نہیں آتا، اسی طرح شریعت کے تقاضوں پر جب تک عمل نہ کرلوں، اس وقت تک چین نہیں آتا۔

﴿۲﴾...... مادح اور ذام یکساں ہوگئے ہیں۔

یعنی تعریف کرنے والا اور برائی کرنے والا دونوں برابر ہوگئے ہیں، کوئی تعریف کرے تو، اور کوئی برائی کرے تو، دونوں کے اندر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا کہ یہ تعریف کر رہا ہے اور یہ برائی کر رہا ہے، نہ تعریف سے طبیعت میں کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے اور نہ برائی سے طبیعت میں کوئی تغیر آتا ہے۔

﴿۳﴾...... کسی مسئلہ شرعی میں کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔

جب یہ خط تھانہ بھون میں حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچا تو آپ نے وہ خط اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا کہ:

یہ حال جو انہوں نے لکھا ہے، یہ تو اب تک ہمیں بھی حاصل نہیں ہوا۔

بہر حال! یہ کیسے شیخ اور کیسے مرید تھے۔ یہ ایسے ہی نہیں بن جاتے، بلکہ کچھ رگڑے کھانے پڑتے ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ کا ایک اور واقعہ

انہی چالیس دن کے قیام کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک دن حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنے مرید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو بلایا کہ آج تم ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ، چنانچہ کھانے کے وقت تشریف لے آئے، دستر خوان پر سالن کے دو پیالے تھے، ایک میں کوفتے ایک میں دال تھی، حضرت حاجی صاحبؒ نے کوفتے کے سالن کا پیالہ اپنے پاس رکھا اور دال کا پیالہ ان کے سامنے رکھ دیا، اشارہ اس طرف کر دیا کہ دال تم کھاؤ، کوفتے ہم کھائیں گے، کھانے کے دوران حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ پہنچ گئے، حافظ صاحبؒ نے فرمایا کہ:

حضرت! یہ کیا آپ کر رہے ہیں کہ خود تو کوفتے کھا رہے ہیں اور اس کو دال کھلا رہے ہیں؟

حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ:

ارے یہ تو میرا احسان ہے کہ اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلا رہا ہوں، حق تو یہ تھا کہ روٹی پر دال رکھ کر ہاتھ میں دیدیتا کہ باہر سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھالے۔

یہ الفاظ کہنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے چہرے کی طرف دیکھا کہ اس بات سے ان کے چہرے پر کوئی تغیر آیا یا نہیں؟ دیکھا کہ کوئی تغیر نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ الحمدللہ کبر کی بیماری نکل گئی ہے۔ بہرحال! اس طرح رگڑے دیے جاتے ہیں، تب جاکر علاج ہوتا ہے، ہر ایک کے بس کا کام نہیں کہ وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرلے کہ میرا کیا علاج ہے۔

شیخ سے علاج تجویز کراؤ

ایک صاحب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا کرتے تھے، وہ اپنا علاج خود تجویز کرلیا کرتے تھے، خود ہی فیصلہ کرلیا کہ میرے اندر تکبر کی بیماری ہے اور پھر خود ہی اپنا علاج تجویز کرلیا۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحبؒ نے ان کو پکڑ لیا اور فرمایا کہ اس طریقے سے تمہارا نفس اور زیادہ موٹا ہو رہا ہے، اور تمہارے اندر اور زیادہ تکبر بڑھ رہا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اس "تکبر" کی بیشمار قسمیں ہیں، ہر ایک کا حکم الگ ہے، ہر ایک کا علاج الگ ہے۔ اس لئے اس کے علاج کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو کسی شیخ کے حوالے کردو۔ وہ شیخ پہلے یہ دیکھے گا کہ تکبر ہے یا نہیں؟ کیونکہ بعض اوقات حقیقت میں تکبر نہیں ہوتا، بلکہ تکبر کا شبہ اور دھوکہ

ہوتا ہے۔ بعض اوقات تکبر ہوتا ہے مگر اسے تکبر نہیں سمجھا جاتا، اس لئے شیخ پہلے تشخیص کرے گا کہ اس کے اندر تکبر ہے یا نہیں؟ تشخیص کرنے کے بعد وہی اس کا علاج بھی تجویز کرے گا۔

شیخ کی تقلید محض کرو

حتیٰ کہ جو شخص بظاہر عالم اور فارغ التحصیل ہے، قرآن و حدیث اور فقہ و تفسیر سب کچھ پڑھا ہوا ہے، بظاہر تو وہ سب کچھ جانتا ہے، لیکن ایسے عالم کو بھی شیخ محقق کی تقلید محض کرنی پڑتی ہے، جب شیخ یہ کہدے کہ تمہارے اندر کبر ہے تو سمجھ لے کہ ہاں میرے اندر کبر ہے، اور پھر اس کا علاج کرائے، چوں و چرا کی گنجائش نہیں، اگر چوں و چرا کرے گا تو مارا جائے گا۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ:

تلمیذے کہ چون وچرا نکند و مریدے کے چون وچرا کند، ہر دورا بصحرا باید فرستاد۔

یعنی وہ شاگرد جو علم ظاہر حاصل کر رہا ہے، اگر وہ چوں و چرا نہ کرے، اس کو باہر نکال دو، وہ شاگرد بننے کے لائق نہیں، اس کا کام ہی یہ ہے کہ سمجھنے کے لئے سوال کرے، جو شبہ پیدا ہو جائے اسے پیش کرے۔ اور جو شخص کسی شیخ کا مرید ہو، وہ چوں و چرا کرے کہ یہ آپ نے کیوں کیا؟ ایسا کیوں کیا؟ ایسے مرید کو جنگل بھیج دینا چاہئے، وہ مرید بنائے جانے

کے قابل نہیں ہے۔ لہٰذا شاگرد کا وظیفہ یہ ہے کہ چون وچرا کرے اور سوال کرے، جو شاگرد سبق میں خاموش بیٹھا ہے اور کبھی کچھ پوچھتا ہی نہیں، وہ احمق ہے، وہ سبق کا حق ادا نہیں کر رہا، اور مرید کا کام یہ ہے کہ وہ خاموش بیٹھے، وہ چون و چرا نہ کرے، وہ اگر چوں و چرا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر خرابی ہے۔

لہٰذا جو عالم ظاہر ہو، اس کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ بلاچوں وچرا شیخ کی بات کو تسلیم کرے، اس لئے کہ علم کے اندر خود رفعت کی شان موجود ہے، لہٰذا جس شخص کو کوئی علم حاصل ہو جاتا ہے، اس کے اندر خود بخود ترفع اور بڑائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ میرے اندر یہ کمال حاصل ہوا۔ اس لئے اکثر و بیشتر علم کے ساتھ تکبر آ ہی جاتا ہے، جب تک اس کی تربیت نہ ہو اور رگڑے نہ کھائے۔

بھائی ذکی کیفی مرحومؒ کا واقعہ

میرے سب سے بڑے بھائی محمد ذکی کیفیؒ مرحوم تھے، جو شاعر بھی تھے۔ بچپن میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں کافیہ اور شرح جامی تک کتابیں پڑھی تھیں اس کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا، پھر تجارت وغیرہ میں لگ گئے، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی جان! آپ نے تعلیم مکمل کیوں نہیں کی تھی، درمیان میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟ جواب میں فرمایا کہ بڑے میاں نے ہمارا معاملہ ختم کر دیا

تھا۔ "بڑے میاں" سے مراد حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ میں نے پھر سوال کیا کہ قصہ ہوا تھا؟ فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میں گھر سے دارالعلوم دیوبند پڑھنے کے لئے جا رہا تھا، راستے میں حضرت میاں صاحب کا مکان تھا، اور حضرت میاں صاحب گھر میں تشریف فرما تھے۔ ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میاں صاحب کے گھر کے پاس سے گزریں اور میاں صاحب سے سلام کر کے اور دعا کرا کے نہ جائیں۔ میں نے سوچا کہ حضرت میاں صاحب موجود ہیں، چلو ان کو سلام کر کے دعا کرالوں پھر مدرسہ جاؤں۔ میاں صاحب اپنے پاس بادام وغیرہ بھی رکھا کرتے تھے، جب کوئی بچہ ان کے پاس ملاقات کے لئے آتا تو اس کو بادام وغیرہ بھی دیا کرتے تھے۔

"علم" تعلّی کا سبب

بہر حال! میں ان کے پاس گیا اور جا کر سلام کیا، حضرت میاں صاحب نے جواب دیا، پھر میں نے دعا کی درخواست کی: حضرت! میرے لئے دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے علم عطا فرما دے۔ بڑے میاں نے جواب دیا، نا بھائی نا، علم بڑی خراب چیز ہے، میں تمہارے واسطے دعا نہیں کرتا۔ میں بڑا پریشان ہوا کہ یا اللہ! یہ کیا فرما رہے ہیں کہ علم بڑی خراب چیز ہے۔ پھر اپنے بارے میں فرمانے لگے کہ میاں صاحب پہلے دارالعلوم میں مولسری کے درخت کے نیچے پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھا

کرتا تھا، اور اب چوکی پر بیٹھ کر پڑھاتا ہے، اور اب میاں صاحب سے کہو کہ نیچے بیٹھ کر پڑھادو تو میاں صاحب کے مزاج میں فرق آجاتا ہے۔ میاں! علم تو تکبر پیدا کرتا ہے، اس واسطے میں تمہارے واسطے علم کی دعا نہیں کرتا۔ بھائی جان کہتے ہیں کہ مجھے اسی دن خطرہ ہو گیا تھا کہ بڑے میاں نے ہمارا تو پتہ صاف کر دیا، اب یہ علم پورا ہونے والا نہیں۔ بہر حال! وہ تو صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان پر منکشف فرمایا ہو گا کہ اس علم کی تکمیل ان کے حق میں مقدر نہیں ہے، اِس لئے مناسب طریقے سے بچے کو بتا دیا۔

لیکن بات جو ارشاد فرمائی وہ یہ تھی کہ علم تکبر پیدا کرتا ہے، لہٰذا اگر علم کی وجہ سے تکبر پیدا ہو گیا، تو پھر اس علم سے ہزار درجہ بہتر یہ تھا کہ آدمی جاہل رہتا، اور ایک ان پڑھ دیہاتی کی طرح زندگی گزارتا تو کم از کم اللہ تعالیٰ کے یہاں جاکر علم کے اس تکبر اور بڑائی کا عذاب نہ ہوتا۔ اس لئے علم کے ساتھ اکثر و بیشتر یہ چیز جمع ہو جاتی ہے اور اس کا حل اس کے علاوہ کوئی اور نہیں کہ اپنی لگام کسی کے حوالے کرے، وہ یہ دیکھے کہ کیا بیماریاں اس کے اندر پیدا ہو رہی ہیں، اور جو بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں، ان کا علاج کرے۔

علم دو دھاری تلوار ہے

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ علم دو دھاری تلوار ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس علم میں نور عطا فرمادے، اس میں برکت عطا فرمادے اور اس کو نافع بنادے تو پھر سبحان اللہ، یہ علم کیا عجیب و غریب چیز ہے۔

لیکن اگر خدانخواستہ اس علم میں نور اور برکت نہ ہو، اس میں نافعیت نہ ہو، اور یہ انسان کو کبر اور گھمنڈ میں مبتلا کر دے تو پھر اس علم سے زیادہ مہلک چیز بھی کوئی نہیں ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جتنی مرغن اور شاندار اور مزیدار غذا ہوتی ہے، سڑنے کے بعد وہ اتنی ہی زیادہ بدبودار بن جاتی ہے، اگر معمولی غذا ہے، جس میں روغن نہیں ہے، اس کے سڑنے سے تھوڑی بہت بدبو پیدا ہوگی، لیکن مرغن غذا سڑنے کے بعد سارے محلے کو متعفن کر دے گی۔ اسی طرح جتنے اونچے سے انسان گرتا ہے، اتنی ہی چوٹ زیادہ لگتی ہے، اسی طرح یہ علم اگرچہ اعلیٰ درجے کی چیز ہے، لیکن اگر یہ خراب ہو جائے اور انسان کو تکبر اور گھمنڈ میں مبتلا کر دے تو یہ علم انسان کے لئے اتنا ہی مہلک ہے، اس لئے خاص طور پر عالم کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ کسی سے اپنی اصلاح کرائے۔

شیطان کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا کہ کسی شخص نے خواب میں شیطان کو دیکھا کہ وہ بہت ساری گٹھریاں اپنی کمر پر اٹھائے لے جا رہا ہے۔ جیسے بنجارہ ایک شہر سے دوسرے شہر سامان اٹھا کر لے جاتا ہے اور بیچتا ہے، اسی طرح وہ بھی سامان لے جا رہا ہے، اب گٹھریوں کو دیکھا تو کسی گٹھری میں پاخانہ بھرا ہوا ہے، کسی میں لید، کسی میں گوبر، اور کسی میں پیشاب بھرا ہوا ہے، اس نے شیطان سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ شیطان نے ایک گٹھری کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ تکبر ہے، دوسری گٹھری کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ حبّ جاہ ہے، کسی کی

طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ حسد ہے وغیرہ، لیکن یہ سب چیز نجاستوں کی شکل میں تھیں۔ ان صاحب نے پھر شیطان سے پوچھا کہ ان کو کہاں لے جا رہا ہے؟ شیطان نے جواب دیا کہ ان کو لے جاکر فروخت کروں گا۔ ان صاحب نے پھر پوچھا کہ پیسے دے کر تجھ سے یہ نجاستیں کون خریدے گا؟ شیطان نے جواب دیا کہ اپنے مال کی منڈی میں جانتا ہوں، اور اس کے گاھک اور خریداروں کو میں جانتا ہوں، یہ ''تکبر'' اور ''حُبّ جاہ'' یہ دو نجاستیں میں مولویوں کے پاس جاکر بیچوں گا، وہ ان دونوں کے بڑے شوقین ہیں، ان کو ان دونوں کے کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ حُبّ جاہ کا کیا مطلب ہے؟ ''حُبّ جاہ'' کے معنی ہیں ''شہرت'' کہ لوگ میرے آگے جھکیں، لوگ میرے معتقد بنیں، لوگ میری تعریف کریں، میری شہرت ہو، یہ سب ''حُبّ جاہ'' ہے۔ ''حُبّ جاہ'' کو بیچنے کی سب سے بہترین منڈی ''مولوی صاحبان'' ہیں، وہاں جاکر اس کو بیچوں گا، وہ خوب مزے لے کر اس کو کھائیں گے۔

''ہم بھی کچھ ہیں'' کا خیال

بہر حال! یہ علم ایک تو بذاتِ خود فی نفسہ طالبِ علو ہے، اس لئے صاحبِ علم کے اندر تکبر پیدا کرتا ہے۔ دوسری آفت اس علم میں یہ ہے کہ لوگ حاملِ علم دین کی عزت کرتے ہیں، کوئی اس کے ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی اس کے پاؤں چوم رہا ہے، کوئی اس کے لئے عزت سے کھڑا ہو رہا ہے، کوئی اس کے لئے ہدیہ لا رہا ہے، کوئی دعوت کر رہا ہے، ان افعال کے نتیجے میں وہ حاملِ علم اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں، یہ اتنی ساری مخلوق جو ہماری عزت کر رہی

ہے، ہمارے پیچھے پھر رہی ہے، آخر کچھ تو ہمارے اندر کمال ہوگا۔

ایک لالچی کا واقعہ

چنانچہ اہل علم کی ایک مثال دیتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ "اشعب طماع" ایک بہت لالچی انسان تھا۔ ایک مرتبہ راستے سے گزر رہا تھا، بچے اس کو چھیڑنے کے لئے اس کے پیچھے لگ گئے، ان بچوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس نے بچوں سے کہا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو، فلاں جگہ جاؤ، وہاں مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے، چنانچہ بچے اس طرف بھاگے تو خود بھی بچوں کے پیچھے بھاگنے لگا، لوگوں نے پوچھا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ سب بچے بھاگ رہے ہیں تو ضرور مٹھائی تقسیم ہو رہی ہوگی۔ ہماری مثال بھی ایسی ہے کہ پہلے اپنے علم کے ذریعہ مخلوق کو دھوکہ دیا، اس دھوکہ دینے کے نتیجے میں جب مخلوق ہماری معتقد ہو گئی، اب کوئی ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی دعوت کر رہا ہے، کوئی ہدیہ لا رہا ہے، کوئی علامہ کا لقب دے رہا ہے، تو اب دماغ میں یہ خیال آیا کہ جب اتنی ساری مخلوق ہمارے پیچھے چل رہی ہے اور ہماری معتقد ہو رہی ہے تو ہمارے اندر ضرور کوئی وصف ہوگا جس کی وجہ سے یہ ساری مخلوق ہماری معتقد ہو رہی ہے۔

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

اس کے نتیجے میں وہ عالم اور زیادہ تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

علم پر شکر ادا کریں

لہٰذا جو حضرات علم دین سے وابستہ ہیں، یا جن کو اللہ تعالیٰ نے کوئی اور وصف عطا فرمایا ہے، ان کو اس کی بہت زیادہ فکر رکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں یہ بیماری پیدا نہ ہو جائے۔ اور اگر پیدا ہو جائے تو اس کا فوری علاج ضروری ہے، وہ علاج یہ ہے کہ اس علم پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کریں کہ یا اللہ! میں اس علم کا مستحق نہیں تھا، پھر بھی آپ نے عطا فرما دیا، اے اللہ! آپ کا شکر ہے۔ اور اس بات کا استحضار کرے کہ یہ علم ان کی عطا ہے، اور وہ جب چاہیں واپس لے لیں، میرا اس پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

لِکَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا۔

سب کچھ پہلے معلوم تھا، بعد میں سب رخصت ہو گیا، اور اب کچھ بھی باقی نہیں۔ اگر انسان کے دماغ کا ذرا سا اسکرو ڈھیلا ہو جائے، تو ایک سیکنڈ کے اندر سارا علم، ساری معرفت، ساری تحقیقات، سب ختم ہو جائیں، لہٰذا انسان کس بات پر اترائے؟ کس بات پر ناز کرے؟ کس بات پر اکڑے؟

عالم اور شیخ کے درمیان فرق

اسی وجہ سے حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ جو اپنے وقت میں علم کے پہاڑ تھے، لیکن اپنی اصلاح کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گئے، جو ضابطے کے پورے عالم بھی نہیں تھے، لوگوں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! یہ کیا قصہ ہوا کہ الٹا معاملہ ہو گیا

؟ ان کو چاہئے تھا کہ وہ آپ کے پاس آتے، اس لئے کہ آپ عالم ہیں، وہ عالم نہیں ہیں، لیکن آپ ان کے پاس چلے گئے۔

ایک مثال

جواب میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہماری اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو مٹھائی کے بارے میں پورا علم اور پوری تحقیق حاصل ہے، مثلاً اس کو گلاب جامن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ یہ سب سے پہلے کس نے ایجاد کی، اس کا موجد کون ہے، کہاں کہاں یہ متعارف ہوئی، کن ملکوں میں یہ کھائی جاتی ہے، کن چیزوں سے اس کو بنایا جاتا ہے، اس کے اجزاء ترکیبی کیا کیا ہیں، اور اس کی کتنی قسمیں ہیں، اور اس کو کیسے پکایا جاتا ہے، اور کیسے تلا جاتا ہے، اور اگر اس سے کہا جائے تو وہ گلاب جامن کے فضائل پر ایک تقریر کر دے اور ایک مقالہ لکھدے۔ لیکن اس سے پوچھا جائے کہ تم نے کبھی گلاب جامن کھائی ہے؟ تو وہ جواب میں کہے میں نے کبھی نہیں کھائی۔ ایک دوسرا شخص ہے جس کو گلاب جامن کی تاریخ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ کس نے ایجاد کی، کون اس کا موجد ہے، کس طرح پکائی جاتی ہے، لیکن روزانہ صبح و شام گلاب جامن کھاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ بتاؤ ان دونوں میں سے کون بہتر ہے؟ وہ بہتر ہے جس میں گلاب جامن پر مقالہ لکھنے کی صلاحیت ہے یا وہ بہتر ہے جو روزانہ صبح و شام گلاب جامن کھاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ بہتر ہے جو روزانہ صبح و شام کھاتا ہے، اگرچہ اس کی تعریف بیان نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا کہ ہماری مثال اس شخص کی سی ہے جس کو گلاب جامن کی پوری

تاریخ معلوم ہے، اس کی لغوی اور اصطلاحی تعریف جانتا ہے، لیکن کھائی کبھی نہیں، اور حاجی صاحب وہ ہیں جو روزانہ کھاتے ہیں، جب ہم حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں گئے تو ہم نے صرف گلاب جامن کی تاریخ ہی پڑھی تھی، انہوں نے گلاب جامن اٹھا کر ہمارے منہ میں رکھ دی کہ لو گلاب جامن کھالو۔ اس لئے ہم حاجی صاحب کی خدمت میں گئے تھے۔ بہر حال! علم والے کو خاص طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ باطن کی اصلاح کرائے اور کسی شیخ سے تربیت حاصل کرے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

پندرہویں مجلس

کبر کا ایک اور علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرھویں مجلس

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلوٰة والسلام علیٰ رسوله الکریم، وعلیٰ آله واصحابه أجمعین أمابعد!

کبر کا ایک علاج

"فرمایا کہ کبر کا ایک علاج یہ ہے کہ عظمت حق سبحانہ کو پیش نظر رکھے، جس موقع پر کبر کا اندیشہ ہو اس وقت تو ضرور ورنہ اور بھی بہتر یہ ہے کہ روزانہ ایک وقت اس کے لئے نکال لے"

کبر کا ایک علاج یہ ہے کہ انسان اللہ جل جلالہ کی عظمت کا استحضار کرے، اور اس کے ساتھ اپنی بے وقعتی کا استحضار کرے۔ اس کے علاوہ ایک بزرگ کے جواب کا استحضار کرے جو جواب ان بزرگ نے ایک متکبر کو دیا تھا، ایک متکبر نے ان بزرگ سے کہا کہ جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں تو کون ہے؟ تیری حقیقت یہ ہے کہ:

أولك نطفة مذرة، وآخرك جيفة قذرة

وأنت فيما بين ذلك تحمل العذرة

یعنی تیری ابتداء تو ایک گندہ نطفہ ہے، اور تیری انتہاء بدبودار مردار پر ہونے والی ہے۔ تو ایسی حالت میں پہنچنے والا ہے کہ تیرے عزیز و اقارب اور رشتہ دار بھی تجھے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے، بلکہ تجھے گھڑے میں پھینک آئیں گے، اس لئے کہ اگر تجھے اور زیادہ گھر میں رکھا گیا تو گھر میں بدبو پھیلا دے گا۔ لہٰذا تیری ابتداء اور انتہا تو یہ ہے، اور دونوں کے درمیان کا جو زمانہ ہے، اس میں تو ہر وقت نجاست اٹھا کر پھر رہا ہے۔

کھال کے ذریعہ پردہ پوشی

اللہ تعالیٰ نے اس کھال کے ذریعہ پردہ پوشی فرمار کھی ہے، یہ کھال اگر کسی جگہ سے چھیل دی جائے تو اندر سے گندگی بر آمد ہو جائے گی، کہیں سے خون نکل آئے گا، کہیں سے پیپ نکل آئے گی، کہیں سے پیشاب نکل آئے گا، کہیں سے پاخانہ نکل آئے گا۔ پورے جسم میں گندگی ہی گندگی بھری ہوئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کھال کے ذریعہ پردہ پوشی فرمار کھی ہے جس کی وجہ سے وہ نجاست نظر نہیں آتی۔ حضرت والا فرماتے ہیں جب کبھی تمہارے دل میں اپنی بڑائی کا احساس پیدا ہو تو ذرا اس بات کو سوچ لیا کرو کہ میری ابتداء کہاں سے ہوئی اور میرا انجام کیا ہونا ہے۔

قضاء حاجت کی حالت کا تصور

حضرت فرماتے ہیں: ایک کار آمد نسخہ اور بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب دل میں تکبر پیدا ہو، اس وقت اپنی اس حالت کا تصور کر لیا کرو جب قضاء حاجت کے لئے بیٹھتے ہو، اس وقت کیا حالت ہوتی ہے اور کیا شان ہوتی ہے۔ بس

سارا تکبر دھرا رہ جائے گا اور پتہ چل جائے گا کہ میری حقیقت تو یہ ہے۔

بہر حال اللہ جل جلالہ کی عظمت کا استحضار اور اپنی بے وقعتی کا استحضار کرے۔ کس بات پر انسان ناز کرے؟ کس چیز پر فخر کرے؟ نہ کوئی چیز اپنی ہے، نہ اپنی طاقت سے حاصل ہوئی، نہ اپنے بل بوتے پر باقی رہ سکتی ہے، جو کچھ حاصل ہے، وہ سب کسی کی عطا ہے۔

ایک اور علاج

"فرمایا کہ: علاج ہی کا ایک جزو یہ ہے کہ قصداً ایسے افعال اختیار کرے جو عرفاً موجب ذلت سمجھتے ہیں۔ اور بدون اس کے دوسرے علاج ناکافی ہیں"

یعنی قصداً ایسا کام اختیار کرے جس کو عام طور پر لوگ ذلت کا کام سمجھتے ہیں، بطور علاج کے وہ کام کرے۔ جیسے صحابہ کرام کیا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا اپنا علاج کرنا

حضرت فاروق اعظمؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شاندار جبّہ پہن کر خطبہ دیا، وہ جبہ بہت پسند آیا اور اپنا سراپا اچھا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جبہ اتارا اور مشک اٹھا کر کمر پر لادی، اور پانی بھر کر لوگوں کے گھروں میں پہنچانا شروع کر دیا۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمانے لگے کہ چونکہ میرے دل میں عجب کا خیال آگیا تھا، اس لئے اس کے ذریعہ میں اس عجب کا علاج کر رہا ہوں۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور گورنری

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ درس و تدریس کے کام لگے رہتے

تھے، ان کو سیاست سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ایک مرتبہ بحرین کے گورنر چھٹی پر جارہے تھے، ان کی جگہ پر ان کو گورنر بنادیا گیا۔ چونکہ درویش آدمی تھے، ساری عمر قال اللہ وقال الرسول میں گزاری تھی۔ سارا دن گورنری کے کام میں مشغول رہتے، شام کو لکڑیوں کا ایک گٹھر سر پر رکھتے اور بازار کے درمیان سے اس طرح گزرتے کہ آواز لگاتے جاتے کہ ہٹو! امیر المومنین آرہے ہیں ہٹو! امیر المؤمنین آرہے ہیں۔ گویا کہ راستے میں لوگوں کو متنبہ بھی کرتے جاتے کہ یہ امیر المؤمنین آرہا ہے جس کے سر پر لکڑی کا گٹھر ہے۔ یہ کام اس لئے کرتے کہ کہیں گورنری کی شان کی وجہ سے دماغ میں تکبر پیدا نہ ہوجائے، اس طرح سے اپنا علاج خود کیا۔

حضرت گنگوہیؒ کا طلبہ کے جوتے اٹھانا

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، جو "قطب الارشاد امام وقت اور ابو حنیفہ عصر" کے لقب سے مشہور ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "ارواح ثلاثۃ" میں ان کا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت والا ایک دفعہ سبق پڑھا رہے تھے اور بارش شروع ہوگئی تو طلبہ سے فرمایا کہ اندر چلیں۔ طلبہ اپنی اپنی کتابیں لے کر اندر جانے لگے، اور حضرت والا طلبہ کے جوتے سمیٹ کر اندر لے جانے لگے تاکہ وہ بارش میں بھیگ کر خراب نہ ہوجائیں۔

یہ طلبہ کے جوتے دو وجہ سے اٹھا رہے تھے: ایک اپنے علاج کی غرض سے کہ کہیں میرے اندر تکبر کا شائبہ پیدا نہ ہوجائے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب انسان یہ علاج کرلیتا ہے تو اس کا نفس مزکی اور مجلی ہوجاتا ہے اور

جب اللہ والے کا نفس مزکیٰ اور مجلّٰی ہو جاتا ہے تو اس کو یہ بات غیر معمولی معلوم نہیں ہوتی کہ میں طلبہ اور شاگردوں کے جوتے اٹھا رہا ہوں بلکہ یہ کام بھی اس کے معمول کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

حضرت تھانویؒ کی سید سلیمان ندویؒ کو نصیحت

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حضرت سید سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے گئے۔ پورے ہندوستان میں جن کے علم کا ڈنکا بج رہا تھا، "سیرۃ النبی" کے مصنف، محقق وقت، اور سیاسی اعتبار سے بھی لوگوں کے اندر مشہور و معروف۔ حضرت سید صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ میں جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے رخصت ہونے لگا تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! کوئی نصیحت فرمادیں۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! یہ اتنے بڑے عالم ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں نصیحت کروں۔ یا اللہ! ایسی نصیحت دل میں ڈال دیجئے جو ان کے حق میں فائدہ مند ہو۔ تو اس وقت بیساختہ میرے دل میں یہ بات آئی کہ ہمارے یہاں اول و آخر ایک ہی چیز ہے، وہ یہ کہ اپنے آپ کو مٹا دینا۔ حضرت سید صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بات کہتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا، وہ جھٹکا میرے دل پر ایسا لگا کہ اسی وقت گریہ طاری ہو گیا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس کے بعد حضرت سید صاحب نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا، ایسا مٹایا کہ میں نے ایسی بہت کم نظریں

دیکھی ہیں کہ اتنے بڑے عالم نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا ہو۔ اس طرح مٹایا کہ میں نے ایک دن حضرت سید صاحب کو دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کے باہر حاضرین مجلس کی جوتیاں سیدھی کر رہے ہیں۔

علوم تو ان بڑے میاں کے پاس ہیں

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سہ دری میں بیٹھ کر تصنیف کا کام کر رہے تھے، اور حضرت سید صاحب دور ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے جہاں سے حضرت تھانوی ان کو نہ دیکھ سکیں۔ میں اچانک پیچھے سے ان کے قریب پہنچا اور کہا کہ حضرت! یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کیا دیکھ رہے ہیں؟ میرے سوال پر اچانک چونک پڑے اور کہا کہ کچھ نہیں۔ میں نے جب اصرار کیا تو فرمایا کہ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ساری زندگی جن چیزوں کو علوم سمجھتے رہے، وہ تو جہل ثابت ہوئے، علوم تو ان بڑے میاں کے پاس ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت سید صاحب کو وہ مقام بخشا کہ خود ان کے شیخ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں یہ شعر کہا:

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل
داں تو ندوی را منزہ از دغل

یہ شعر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سید صاحب کے بارے میں کہا۔ بہر حال، اپنے آپ کو مٹانا پڑتا ہے، تب جا کر کچھ بنتا ہے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو گر کچھ مرتبہ چاہئے
کہ دانہ خاک میں ملکر گل گلزار بنتا ہے

کسی کے در پر رگڑے کھائے بغیر یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہا جاتا ہے کہ شیخ کی نگرانی میں یہ عمل کرے۔

حضرت مفتی اعظمؒ کی تواضع

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مطب ابتداء میں رابسن روڈ پر تھا۔ اسی زمانہ میں میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا اسی مطب کے کچھ فاصلے پر مکان تھا، حضرت ڈاکٹر صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مطب میں بیٹھا ہوا تھا اور میرے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب کے پاس ظاہری بیماریوں کے مریض بھی آتے تھے اور باطنی بیماریوں کے مریض بھی آیا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہاتھ میں دودھ کی پتیلی لئے ہوئے سڑک پر سامنے سے گزر رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یا اللہ! یہ مفتی اعظم اس طرح سڑک پر پتیلی ہاتھ میں لئے جارہا ہے۔ جو لوگ مطب میں بیٹھے ہوئے تھے، ان سے میں نے پوچھا کہ یہ شخص جو پتیلی ہاتھ میں لئے جارہا ہے، جانتے ہو یہ کون ہے؟ گوں نے کہ ہم نہیں جانتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ پاکستان کے مفتی اعظم ہیں، اور ہاتھ میں پتیلی لئے ہوئے اس طرح جارہے ہیں جس طرح ایک عام آدمی جاتا ہے۔

کبھی بڑائی کا تصور ہی نہیں آیا

اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تواضع کا وہ مقام عطا فرمایا تھا کہ سچی بات یہ ہے کہ میں نے ایسا متواضع آدمی کوئی نہیں دیکھا۔

ایک تو آدمی بتکلف تواضع کرتا ہے، لیکن ان کے یہاں تواضع کے لئے کوئی تکلف نہیں تھا، کیونکہ ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ میں تو بالکل بے حقیقت ہوں، اور اپنے بارے میں دماغ کے اندر کسی بڑائی کا تصور کبھی آیا ہی نہیں، اسی وجہ سے ان کو معمولی سے معمولی کام کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا میں نے خود دیکھا ہے کہ آپ کرتے کے دامن میں بازار سے آلو خرید کر لے آتے تھے۔

حضرت مدنیؒ کی مفتی صاحبؒ کو نصیحت

دیوبند میں بھی ایک دن اسی طرح دودھ لینے کے لئے پتیلی لے کر جارہے تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو دیکھ لیا اگلے دن جب آپ دارالعلوم دیوبند میں پہنچے تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی صاحب سے فرمایا کہ: دیکھو بھائی مولوی شفیع صاحب! اللہ تعالیٰ نے آپ کو تواضع کا بہت اونچا مقام عطا فرمایا ہے، لیکن اتنی تواضع بھی نہ کیا کرو، اس لئے کہ اب آپ دارالعلوم کے مفتی ہوگئے ہیں، اور اس طرح کے کام کرنے سے بعض اوقات عوام کی نگاہوں میں وقعت کم ہو جاتی ہے، اس لئے اتنی بھی تواضع نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ سمجھتے تھے کہ میں تو کچھ ہوں ہی نہیں، اس لئے میں کیا اہتمام کروں کہ فلاں کام کروں اور فلاں کام نہ کروں۔ اللہ تعالیٰ نے تواضع کا یہ مقام عطا فرمایا تھا۔

کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرو

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرو، اور کبھی کبھی دوسروں کے جوتے سیدھے کردیا کرو۔ ”ارواح الثلاثۃ“ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ اس کے اندر تکبر ہے، اور اس کے تکبر کا علاج کرنا ہے تو اس کو مامور کرتے تھے کہ تم درسگاہ کے باہر طلبہ کے جوتے روزانہ سیدھے کیا کرو۔ اور جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ اس کے اندر کوئی خرابی نہیں ہے تو اس کے جوتے خود سیدھے فرمادیا کرتے تھے۔

شیخ کے بتانے پر ذلت کے کام کرے

یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس راستے میں بعض اوقات ذلت کے کام کرنے پڑتے ہیں، وہ ذلت کے کام بھی اپنی خود رائی سے نہ کرے، خود رائی سے کرنے سے بعض اوقات تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور دماغ اور سڑ جاتا ہے بلکہ شیخ کی نگرانی میں کرے، جب شیخ کہے تو وہ کام کرے اور جب شیخ نہ کہے تو وہ کام نہ کرے۔

ایک صاحب نے کسی کتاب میں پڑھ لیا تھا کہ دوسروں کے جوتے سیدھے کرنے سے تکبر دور ہوتا ہے، چنانچہ وہ صاحب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں آئے اور دوسروں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کردیے۔ حضرت والد صاحب نے ان کو منع کیا کہ یہ کام نہ

کرو، پھر منع کرنے کی وجہ بتائی کہ اس شخص کے حالات ایسے ہیں کہ اگر یہ جوتے سیدھے کریگا تو اور زیادہ اس کے دماغ میں تکبر پیدا ہوگا کہ میرے اندر اتنی تواضع پیدا ہو گئی ہے کہ میں لوگوں کے جوتے سیدھے کرتا ہوں۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ اس راستے میں کسی کی نگرانی میں چلنا پڑتا ہے۔

کبر اور شکر کا فرق

فرمایا کہ:

نعمت پر فخر کرنا "کبر" ہے اور اس کو عطاء حق سمجھنا اور اپنی نااہلی کو مستحضر رکھنا "شکر" ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ "تکبر" کی بیماری کا بہترین علاج کثرت شکر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالنا۔ وہی بات حضرت نے اس ملفوظ میں ارشاد فرمائی کہ کسی نعمت کے حصول پر فخر کرنا کہ اس کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو کمتر سمجھنا، تکبر ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ میں تو اس نعمت کا مستحق نہیں تھا، اللہ جل شانہ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی ہے۔ یہ استحضار "شکر" ہے اور یہی شکر کبر کا علاج ہے۔

یہ "تحدیث نعمت" ہے

اسی کو "تحدیث نعمت" کہا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ذکر کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، نہ صرف یہ کہ یہ چیز تکبر نہیں

بلکہ عبادت ہے۔ اور اپنی بڑائی کا ذکر کر کے اپنا کوئی وصف بیان کرنا تکبر ہے اور زبردست گناہ ہے۔

باطن کے یہ گناہ بہت باریک ہیں، اور ان کی سرحدیں آپس میں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ ایک طرف "تحدیث نعمت" ہے، اگر تحدیث نعمت کی غرض سے انسان اپنا کوئی وصف بیان کر رہا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کا اور اس کی عطاء کا اظہار کر رہا ہے تو یہ "عبادت" ہے، اور اگر اپنی بڑائی کے خیال سے اس کا اظہار کر رہا ہے تو یہ گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان خط امتیاز کھینچنا کہ کیا بات تکبر ہے اور کیا بات "تحدیث نعمت" ہے، یہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

"تحدیث نعمت" کا حکم

"تحدیث نعمت" تو وہ چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دے رہے ہیں، فرماتے ہیں:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (سورۃ الضحیٰ)

یعنی آپ پر آپ کے رب کی جو نعمتیں ہوئی ہیں، ان کو لوگوں کے سامنے بیان کیا کریں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔ اسی "تحدیث نعمت" کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا:

"أنا سيد وُلد آدم، ولا فخر"

میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، یہ "تحدیث نعمت" ہے، کہ اللہ

تعالیٰ نے مجھے یہ مقام عطا فرمایا کہ مجھے تمام آدم کے بیٹوں کا سردار بنادیا۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ "تحدیث نعمت" کبر کی حد میں داخل ہو جائے۔ اس لئے فوراً اگلا جملہ ارشاد فرمادیا "ولا فخر" یعنی میں اس پر کسی فخر کا اظہار نہیں کرتا، جس سے دوسروں کی تحقیر ہو۔ اب دیکھئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے اوپر ہونے والی نعمتوں کا ذکر فرمارہے ہیں، لیکن دھڑکا یہ لگا ہوا ہے کہ کہیں حدود سے متجاوز نہ ہو جاؤں، اس لئے فوراً فرمایا "ولا فخر" میں فخر نہیں کرتا۔

تحدیث نعمت کی علامت

پھر "تحدیث نعمت" کی ایک علامت ہے، وہ یہ کہ "تحدیث نعمت" کے نتیجے میں سر اور زیادہ جھکتا ہے، اور تواضع پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور مزید عاجزی اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انسان یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یا اللہ تعالیٰ میں اس نعمت کا مستحق نہیں تھا، اور میں اس نعمت کو حاصل کرنے سے عاجز تھا، لیکن آپ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی۔ اس استحضار اور اقرار کے نتیجے میں اور زیادہ عاجزی پیدا ہو گی۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ کی انکساری

فتح مکہ کے موقع پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتح بن کر "مکہ مکرمہ" میں داخل ہو رہے ہیں، اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہو رہے ہیں جس شہر کے لوگوں نے آپ کے ہجرت کرنے پر مجبور کیا، جس شہر کے

لوگوں نے آپ کو قتل کے منصوبے بنائے، جس شہر کے لوگوں نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے، جس شہر کے لوگوں نے آپ کے اوپر غلاظتیں ڈالنے کی کوشش کی، جہاں کے لوگوں نے آپ پر پتھر برسانے کی کوشش کی۔ اس شہر کے لوگوں پر فاتح بن کر تشریف لارہے ہیں، صرف ۸ آٹھ سال کی مدت کے بعد تشریف لارہے ہیں۔ آپ کے علاوہ کوئی اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہوتا تو اس کا سینہ تنا ہوا ہوتا، گردن اکڑی ہوئی ہوتی، "أنا ولا غیری" کے نعرے لگارہا ہوتا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ کی گردن مبارک جھکی ہوئی ہے، یہاں تک کہ سینہ مبارک سے آپ کی ٹھوڑی لگ رہی ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اور زبان مبارک پر قرآن کریم کی یہ آیات ہیں:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحاً مُبِيْناً، لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا
تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ
وَيَهْدِيَكَ صِرَاطاً مُسْتَقِيْماً (سورۃ فتح:۱۔۲)

یہ ہے "تحدیث نعمت" کیونکہ "اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحاً مُبِيْناً" کی آیات تلاوت کرکے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا ذکر فرمارہے ہیں کہ یا اللہ! آپ نے یہ فتح مجھے عطا فرمائی۔ اور اس نعمت کے استحضار کے نتیجے میں عاجزی اور انکساری پیدا ہورہی ہے، اور شکستگی پیدا ہورہی ہے، اور رجوع الی اللہ زیادہ ہورہا ہے۔ یہ "تحدیث نعمت" کی علامت ہے۔

تکبر کی علامت

اور تعلّی اور تکبر کی علامت یہ ہے کہ اس سے گردن اکڑتی ہے، سینہ تنتا ہے، اور انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بالا سمجھتا ہے، اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، اور ان کے ساتھ حقارت کا معاملہ کرتا ہے۔ ورنہ کم از کم یہ تو ہوتا ہی ہے کہ وہ دل سے اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور افضل سمجھتا ہے۔ اب دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کرنا کہ کہاں "تحدیث نعمت" ہے، اور کہاں "تکبر" شروع ہو گیا، یہ حد قائم کرنا آسان کام نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شیخ یہ بتاتا ہے کہ تم جو نعمت کا اظہار کر رہے ہو، یہ "تحدیث نعمت" نہیں ہے بلکہ یہ تکبر ہے، لیکن اس کا نام تم نے "تحدیث نعمت" رکھ دیا، حالانکہ حقیقت میں وہ تکبر اور شیطانی عمل تھا۔

حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے نفس کی نگرانی کی توفیق عطا فرماتے ہیں، وہ قدم قدم پر اپنے نفس کا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ کہیں یہ نفس صحیح راستے سے نہ ہٹ جائے۔ میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنا کہ ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ ایک مسجد میں وعظ فرما رہے تھے، بڑا مجمع وعظ سن رہا تھا، اور شرح صدر کے ساتھ وعظ ہو رہا تھا، علوم و معارف کے دریا بہہ رہے تھے۔ اسی وعظ کے دوران کوئی بات حضرت والا کے ذہن میں آئی آپ نے فرمایا کہ اب میں

آپ سے ایک بات کہتا ہوں، اور میں "تحدیث نعمت" کے طور پر کہتا ہوں کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سنیں گے، کسی اور سے یہ بات آپ کو سننے میں نہیں آئے گی۔

ابھی وہ بات کہی نہیں تھی، بلکہ اسی وقت سر جھکایا اور فرمایا استغفر اللہ، میں نے یہ کیا کہہ دیا، میں نے اس کو تحدیث نعمت کا نام دیدیا، حالانکہ یہ تو تعلّی ہو گئی اور اپنی بڑائی کا بیان ہو گیا کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سنیئے گا اور کسی سے نہیں سنیئے گا، میں استغفار کرتا ہوں، یا اللہ: مجھے معاف فرما۔ یہ عمل وہی شخص کر سکتا ہے جسکے دل میں میٹر لگا ہوا ہے، اور وہ میٹر یہ تول رہا ہے کہ کونسا کلمہ حد سے متجاوز ہو گیا اور کونسا حد کے اندر ہے۔ لہٰذا اتنے بڑے انسان، بزرگ، محقق یہ فرمارہے ہیں کہ میں نے تحدیث نعمت کا لفظ تو استعمال کیا، لیکن حقیقت میں تو یہ تعلّی اور تکبر ہو گیا، تو پھر ہم اور آپ کس شمار وقطار میں ہیں۔ ہم لوگ نہ جانے کتنی مرتبہ "تحدیث نعمت" کے عنوان سے اپنے اوصاف بیان کرتے ہیں جب کہ حقیقت میں وہ تعلّی اور تکبر میں داخل ہوتا ہے۔

نعمتوں میں اضافے سے رجوع الی اللہ میں اضافہ

لہٰذا "تحدیث نعمت" کی جو علامت ہے، اس کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس "تحدیث نعمت" کے نتیجے میں عاجزی پیدا ہو رہی ہے یا نہیں؟ خشوع پیدا ہو رہا ہے یا نہیں؟ رجوع الی اللہ میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں؟ اگر یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں تو پھر سمجھ لیجئے کہ یہ "تحدیث نعمت" ہے۔ اور ایک

مؤمن کی علامت ہی یہ ہے کہ اس کو جتنا جتنا نعمتوں سے نوازا جاتا ہے، وہ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ ریز ہوتا چلا جاتا ہے، اپنی بے حقیقتی اس پر عیاں ہوتی چلی جاتی ہے، اپنی عاجزی، اپنی فرومائیگی، اپنی عبدیت اور اپنی بندگی کا احساس اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے، اور اس کو اپنے بندہ ہونے کا احساس ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اس کو جس نعمت سے بھی نوازتے ہیں، وہ پکار اٹھتا ہے کہ یا اللہ! میں تو اس نعمت کے قابل نہیں تھا، آپ نے اپنی رحمت سے عطا فرمادی ہے۔ لہٰذا جتنی نعمت بڑھتی ہے، رجوع الی اللہ میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور نعمتوں پر شکر

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کی اولاد میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت عطاء فرمائی جو تاریخ انسانیت میں کسی کو بھی ایسی حکومت نہ تو پہلے نصیب ہوئی اور نہ بعد میں نصیب ہوئی۔ وہ یہ کہ انسانوں پر حکومت، جنات پر، چرندوں پر، پرندوں پر، فضاؤں پر اور ہواؤں پر حکومت عطا فرمائی۔ یہ نعمتیں دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

﴿اِعْمَلُوْا آلَ دَاوٗدَ شُكْراً وَقَلِيْلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ (سبا: ۱۳)

اے آل داؤد! شکر کا عمل اختیار کرو، اور میرے بندوں میں بہت کم لوگ شکر گزار ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ طے کر رکھا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے جس میں ہمارے

گھر میں کوئی شخص بھی اللہ کا ذکر یا شکر نہ کر رہا ہو، چنانچہ آپ نے اوقات کو تمام گھر والوں پر تقسیم کر دیا تھا کہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک فلاں ذکر میں لگا رہے گا، اس وقت سے اس وقت تک فلاں صاحب ذکر کریں گے۔ دیکھئے! جس طرح نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے تو اسی طرح رجوع الی اللہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور یہ دعا فرما رہے ہیں:

رَبِّ اَوْزِعْنِی اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِی اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰہ وَاَدْخِلْنِی بِرَحْمَتِکَ فِی عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ (النمل:۱۹)

ترجمہ: اے میرے رب! مجھ کو اس پر ہمیشگی دیجئے کہ میں آپ کو ان نعمتوں پر شکر کیا کروں، جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں، اور میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں، اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل رکھئے۔

لہٰذا ایک مؤمن کی خاصیت یہ ہے کہ جوں جوں اس کو نعمتوں سے نوازا جائے گا، اس کے اندر عاجزی اور انکساری پیدا ہو گی، تواضع پیدا ہو گی، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع میں اضافہ ہو گا۔

شریر آدمی کی خاصیت

دوسری طرف شریر آدمی کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو جتنی زیادہ نعمتیں ملیں گی، اتنا ہی اس کی رعونت میں اضافہ ہو گا، اس کی فرعونیت بڑھے گی۔ متنبی شاعر بھی کبھی کبھار بڑی حکیمانہ باتیں کہہ دیتا ہے، چنانچہ وہ

کہتا ہے کہ:

إِذَا أَنْتَ أَكْرَمْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَهُ
وَإِنْ أَنْتَ أَكْرَمْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا

یعنی اگر تم ایک شریف آدمی کی عزت کرو گے، اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرو گے تو تم اس کے مالک بن جاؤ گے، وہ تمہارا غلام بن جائے گا، اس لئے کہ شریف آدمی تمہارا احسان نہیں بھولے گا، اس کے نتیجے میں وہ تمہارا غلام اور تم اس کے مالک بن جاؤ گے۔ اور اگر تم کمینے آدمی کا اکرام کرو گے، تو چونکہ وہ کمینہ آدمی تھا، وہ اکرام کے قابل نہیں تھا، مگر تم نے اس کی عزت کر کے اس کو سر پر چڑھا دیا، تو اس کے نتیجے میں وہ سرکش بن جائے گا۔

یہی معاملہ ہر انسان کا ہے کہ اگر کسی انسان کو نعمتیں ملتی جائیں اور اس کے نتیجے میں اس کا سر اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتا چلا جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ بندہ شکر گزار ہے، اور اب اگر وہ نعمت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ الحمد للہ مجھے فلاں نعمت حاصل ہے اور یہ بات وہ ڈرتے ڈرتے کہتا ہے کہ کہیں تکبر اور تعلّی نہ ہو جائے، تو معلوم ہوا کہ یہ "تحدیث نعمت" کے طور پر یہ بات کہہ رہا ہے۔ اور اگر نعمت ملنے کے بعد وہ منہ اٹھا کر اپنی بڑائی بیان کر رہا ہے کہ میں نے ایسا ہوں، میں نے ایسا کیا، میں نے ایسا کیا، تو اس صورت میں وہ چاہے "تحدیث نعمت" کے الفاظ استعمال کرے، لیکن حقیقت میں وہ "تحدیث نعمت" نہیں بلکہ وہ تکبر ہے۔

شیخ کی ضرورت

یہ تو "تحدیث نعمت" کی علامت ہے، لیکن انسان خود سے اس علامت کو اپنے اوپر منطبق نہیں کر سکتا، اسلئے شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کسی نعمت کا اظہار کرے تو اپنے شیخ سے پوچھے کہ فلاں موقع پر میں نے فلاں نعمت کا اظہار کیا تھا، آیا یہ حدود سے متجاوز ہوا یا نہیں؟ وہ شیخ بتائے گا کہ اس حد تک ٹھیک ہے اور اس حد کے بعد غلط ہے۔ اور جب پندرہ بیس مرتبہ شیخ کو بتایا اور شیخ نے اس کی اصلاح کر دی تو اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ خود ذہن کے اندر ایک ترازو قائم ہو جائے گا، پھر انسان کو خود اس بات کا ادراک ہونے لگے گا کہ کہاں میرا قدم صحیح ہے اور کہاں غلط ہے، اور کہاں تکبر ہے اور کہاں "تحدیث نعمت" ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

سولہویں مجلس

گناہ گار کی تحقیر نہ کریں

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سولہویں مجلس

الحمد للّٰہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین امابعد!

برے کام کرنے والے کو کم نہ سمجھو

فرمایا کہ: یہ جائز ہے کہ برا کام کرنے والے پر غصہ کرو، اس سے بغض کرو، مگر اپنے سے کم نہ سمجھو، اور کبھی تم کو کسی کی سزا وتادیب کے واسطے مقرر کیا جائے تو خبر دار! اپنے کو اس سے اچھا ہرگز نہ سمجھنا، ممکن ہے کہ وہ خطاوار شہزادے کے مثل ہو اور تم نوکر جلاد کے درجہ میں ہو، ظاہر ہے کہ خطاوار شہزادے کو بادشاہ جلاد کے ہاتھوں سزا دلوائے تو جلاد اس سے افضل نہیں ہو سکتا۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۵)

یعنی ایک آدمی برا کام کر رہا ہے، اور وہ کسی ناجائز اور گناہ کے کام میں مبتلا ہے، تو اس پر غصہ کر سکتے ہو، اور اس سے بغض رکھ سکتے ہو یعنی اس کے اس عمل سے نفرت کر سکتے ہو، کیونکہ اس کا یہ عمل قابل نفرت ہے، لیکن اس کو اپنے سے کم نہ سمجھو۔ یعنی ایک طرف اس کی برائی کو برائی سمجھو، اور دوسری طرف اس کو اپنے سے کمتر بھی نہ سمجھو، یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوں؟

نفرت گناہ سے، نہ کہ گناہ گار سے

اس بات کو دو لفظوں میں یوں سمجھو! کہ "فسق" سے نفرت کرو، فاسق سے نفرت نہ کرو۔ یعنی فاسق کی ذات سے نفرت نہ کرو، بلکہ اس کے فعل سے نفرت کرو۔ کفر سے نفرت کرو، کافر کی ذات سے نفرت نہ کرو۔ اور فاسق اور فاجر کو یہ سمجھو کہ یہ بیمار ہے، جب کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو کیا اس بیمار سے نفرت کی جاتی ہے؟ نہیں، بلکہ بیماری سے نفرت کی جاتی ہے کہ اس کو بڑی خراب بیماری لگ گئی ہے، لیکن بیمار پر انسان ترس کھاتا ہے کہ یہ بیچارہ اس بیماری کے اندر مبتلا ہو گیا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے، یا کسی برے کام کے اندر مبتلا ہے تو اس کے برے کام سے نفرت کرو، لیکن اس کی ذات پر ترس کھاؤ۔

گناہ گار ترس کھانے کے لائق

میرے خسر صاحب (جناب بھائی شرافت صاحب) اللہ تعالیٰ ان کو عافیت اور سلامتی کے ساتھ رکھے۔ آمین۔ جب وہ کسی ایسے آدمی کا ذکر

کرتے ہیں جو کسی گناہ یا برے کام میں مبتلا ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں، فلاں بیچارے بدعات میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس کے لئے "بیچارے" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ترس کھانے کے لائق ہے، کیونکہ وہ بیماری کے اندر مبتلا ہے۔ لہٰذا اس کا عمل قابل نفرت ہے، لیکن اس کی ذات ترس کھانے کے لائق ہے۔ اور جب اس کی ذات ترس کھانے کے لائق ہے تو پھر اس کو اپنے سے کم تر سمجھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور بالخصوص اس نقطۂ نظر سے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرما دے، اور توبہ کی توفیق عطا فرما دے، اور اسکے نتیجے میں یہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے، اور میں یہیں پڑا رہ جاؤں۔ اس لئے کسی کو اپنے سے کم تر نہ سمجھو۔

شیطان کس طرح راہ مارتا ہے

جن کو اللہ تعالیٰ دین سے وابستگی عطا فرما دیتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری طلب اور استحقاق کے بغیر۔ الحمد للہ ایسے حلقے سے وابستہ کر دیا جو دین سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن دین سے وابستگی رکھنے والے حضرات جب ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جو دین سے وابستہ نہیں ہیں، بلکہ گناہوں کے اندر مبتلا ہیں، تو بسا اوقات ان کو دیکھ کر ان کی ذات سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے اور اپنی برتری کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ ہم ان سے برتر ہیں۔ بس یہیں سے شیطان راہ مارتا ہے۔ اس لئے اس بات کو یاد رکھیں کہ کسی کی ذات سے نفرت نہ ہو، اگر نفرت ہو تو اس کے عمل سے ہو، اور اس عمل کی وجہ سے اس پر ترس کھاؤ، اور ترس کھانے کے باوجود یہ سوچو کہ پتہ نہیں کب اللہ

تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دیدیں اور یہ ہم سے آگے نکل جائے۔

حضرت تھانویؒ کا انداز تربیت

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایسی پیری نہیں تھی کہ اصلاح کے لئے آنے والوں کو بس وظیفے بتادیے، اور اب وہ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے وظیفے گھونٹ رہے ہیں، اور وظیفے پڑھنے کے نتیجے میں نفس اندر سے پھول رہا ہے۔ بلکہ جب کوئی شخص ان کے یہاں تربیت کرانے کے لئے آتا تو اس کی واقعی تربیت کی جاتی تھی، اور تربیت ہی کے لئے کبھی ڈانٹنے کی اور کبھی غصہ کرنے کی اور کبھی سزا دینے کی ضرورت بھی پیش آتی تھی۔ اسی وجہ سے حضرت والا سخت مشہور تھے، اور حضرت والا کے پاس جہاں اہل علم و فہم اپنی اصلاح کے لئے آتے تھے، وہیں ایک سے ایک اکھڑ اور غیر تہذیب یافتہ آدمی بھی آتا تھا، اور حضرت ہر ایک کی اخلاقی تربیت کرتے تھے اور معاشرت و معاملات میں کسی قاعدے یا اصول کی خلاف ورزی پر روک ٹوک بھی فرماتے تھے، اس میں بھی ہر ایک کے ساتھ اسی کے انداز سے پیش آتے تھے۔

تم بیل ہو تو میں قصائی ہوں

چنانچہ ایک مرتبہ ایک دیہاتی آیا، اس نے کوئی خلاف اصول بات کی، تو اس کو سمجھایا اور ڈانٹا، تو وہ دیہاتی کہنے لگا: اجی حضرت! ہم تو بیل ہیں، جواب میں حضرت نے فرمایا کہ میں بھی تو قصائی ہوں۔ اس طرح ہر ایک کے ساتھ علیحدہ معاملہ ہوتا تھا۔

ایک لطیفہ

ایک مرتبہ آپ حوض پر وضو فرما رہے تھے، اتنے میں ایک دیہاتی ایک بڑا سا تربوز لے کر آگیا اور کہا: لے مولوی: تیرے واسطے لایا ہوں، اس کو کہاں دھر دوں؟ حضرت والا نے وضو کرتے ہوئے فرمایا کہ: "میرے سر پر دھر دے" اس دیہاتی نے وہ تربوز اٹھا کر آپکے سر پر رکھ دیا۔ لوگ جلدی سے دوڑے کہ یہ کیا حرکت کر رہا ہے، حضرت نے فرمایا کہ غلطی میری ہے، میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ سر پر دھر دے۔ ایسے ایسے لوگ آیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی تربیت کے لئے کبھی آپ غصہ بھی فرمایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میرا فرض ہے کہ میں غصہ کروں، اس لئے کہ دیانت کا تقاضہ یہی ہے، اگر یہ نہ کروں تو بددیانتی ہوگی اور امانت میں خیانت ہوگی۔

میری مثال

لیکن فرمایا کہ میں جب بھی کسی پر غصہ کر رہا ہوتا ہوں تو الحمد للہ ذہن سے کبھی یہ بات غائب نہیں ہوتی کہ میری مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ جلاد کو حکم دے کہ شہزادے کو کوڑے مارو، اب وہ جلاد اس حکم پر شہزادے کو کوڑے لگائے گا، لیکن عین اس وقت بھی جس وقت وہ جلاد کوڑے لگا رہا ہوگا، اپنے آپ کو شہزادے سے افضل نہیں سمجھ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں جلاد ہوں، لیکن مارے گا اس لئے کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ الحمد للہ، میں جس وقت کسی کو ڈانٹ رہا ہوتا ہوں اور کسی کام پر کسی کا مؤاخذہ کر رہا ہوتا ہوں تو الحمد للہ اس بات کا استحضار رہتا ہے کہ یہ

شہزادہ یا ورمیں جسلاہوں، میں اس سے افضل نہیں ہوں۔

عین ڈانٹ ڈپٹ کے وقت دعا کرنا

دوسرے یہ کہ جسوقت ڈانٹ رہاہوتا ہوں یا مؤخذہ کررہاہوتا ہوں، اسی وقت دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ یااللہ! مجھ سے ایسا مؤاخذہ نہ فرمایئے گا، آخرت میں میری اس طرح پکڑ نہ فرمایئے گا۔

اب دیکھئے! جو آدمی اس نیت سے ڈانٹ رہا ہو کہ منکر سے روکنا اور اس کی اصلاح کرنا ضروری ہے، اس کا ہمیں حکم ہے، اور ہر ڈانٹ پر اور ہر غصے پر ان دو باتوں کا استحضار رکھتا ہو، اس کا غصہ بھی عبادت نہیں تو اور کیا ہے۔ بہر حال، اس طرح یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ غصہ بھی ہو رہا ہے، برے عمل سے نفرت اور بغض بھی ہے، لیکن اپنے سے اس کو کمتر بھی نہیں سمجھ رہا ہے۔ اپنے کو اس سے افضل بھی نہیں سمجھ رہا ہے لیکن یہ چیز مشق سے اور کسی کے آگے پامال ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل سے حاصل ہوتی ہے۔

سالکین کے کبر اور تواضع مفرط کا علاج

فرمایا کہ: کام کرنے والوں کو دین کا کام کرنے سے دو مرض پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک کبر اور دوسرا تواضع مفرط، کبر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر اپنے اوپر نگاہ کرنے لگے، نماز پڑھ کر بے نمازیوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ اس کا علاج یہ سمجھنا ہے کہ تکبر کی وجہ سے بڑے بڑے عابدوں کے قدم توڑ دیئے گئے ہیں کہ

منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے، شیطان اور بلعم باعور کی حکایت اس کی نظیر ہے۔ "تواضع مفرط" یہ ہے کہ اس حد تک تواضع کرے کہ اپنے اعمال صالحہ کی بے قدری کرنے لگے، مثلاً اس طرح کہ اگرچہ ہم نماز پڑھتے ہیں مگر اس میں خشوع تو ہے نہیں، ذکر کرتے ہیں مگر انوار بالکل نہیں، گویا کہ در پردہ خدا کی شکایت کر رہے ہیں۔ اس کا علاج یہ کہنا ہے کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو ذکر و نماز کی توفیق دی، ورنہ ہماری کیا مجال تھی جو آپ کی بندگی کر لیتے۔

دین کے راستے سے بہکانہ

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو متضاد قسم کی بیماریوں کا ذکر فرمایا ہے۔ جو لوگ دین کے کام میں لگتے ہیں، شیطان ان کو دین کے ذریعہ بہکاتا ہے، شیطان کی اول کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ دین کے کام میں لگے ہی نہیں۔ بلکہ اس بندے کو نفسانی لذتوں اور معصیتوں میں اس طرح پھنسایا جائے کہ دین کے کسی کام کی طرف اس کی توجہ ہی نہ ہو، نہ نماز کی طرف اس کی توجہ ہو، نہ روزے کی طرف، نہ زکوٰۃ اور حج کی طرف اس کی توجہ ہو، بلکہ نفسانیت کے اندر پھنسا رہے۔ اور اگر کوئی شخص دین کے کام میں لگ ہی گیا ہے تو اب اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ دین کا کام کر رہا ہے، اس کو برباد کر دوں، چنانچہ شیطان اس کو برباد کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے، ان طریقوں میں سے دو طریقوں کا حضرت

والا نے اس ملفوظ میں ذکر فرمایا ہے۔

کبر کے ذریعہ بہکانا

پہلا طریقہ یہ ہے کہ شیطان دین کا کام کرنے والے کے دل میں کبر، عجب اور خود پسندی کے خیالات ڈالتا ہے۔ مثلاً اس سے یہ کہتا ہے کہ دیکھ! تو بہت پہنچا ہوا آدمی بن گیا ہے، تو بڑے خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے لگا ہے، تو نماز اور جماعت کا پابند ہو گیا ہے، بہت سے لوگ نماز نہیں پڑھتے اور فسق و فجور کے اندر مبتلا ہیں۔ اس کے نتیجے میں اپنی بڑائی اور بے نمازیوں کی حقارت دل میں آجاتی ہے۔ جو انسان بے ظرف ہوتا ہے، جب وہ ذرا نماز کی پابندی کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ذرا رجوع کرتا ہے تو پھر اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

جولاہے کی مثال

عربی کی ایک مثل ہے کہ "صلّی الحائك رکعتین وانتظر الوحی" ایک مرتبہ ایک جولاہے نے دو رکعت نماز پڑھیں اور نماز کے بعد وحی کا انتظار شروع کر دیا کہ اب میرے اوپر وحی آئے گی۔ یہ ہم لوگوں کا حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ذرا سی عبادت کی توفیق ہو گئی تو بس، دماغ عرش معلی پر پہنچ گیا کہ ہم بڑے عابد، زاہد، متقی اور پارسا ہو گئے ہیں۔ یہ کبر ہے۔ اسکے علاج کے لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ:

تکبر کا ایک علاج

"اس کا علاج یہ سوچنا ہے کہ "تکبر" کی وجہ سے بڑے بڑے عابد ول

کے قدم توڑ دیے گئے ہیں کہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے، شیطان اور ''بلعم باعور'' کی حکایت اس کی نظیر ہے''

یعنی آدمی یہ سوچے کہ اگر میں نے تکبر کیا تو اسکے نتیجے میں یہ سب عمل جو میں کررہا ہوں، یہ سب اکارت ہو جائے گا۔ اس کی نظیر ''شیطان'' ہے اسلئے کہ شیطان پہلے بڑی عبادت کرتا تھا، یہاں تک کہ اس کالقب ''طاؤس الملائکہ (فرشتوں کا مور) پڑ گیا تھا، لیکن اس عبادت کے نتیجے میں دماغ میں خلل اور تکبر آگیا، چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تو اس نے انکار کردیا، اور یہ عقلی دلیل پیش کی کہ اس کو آپ نے مٹی سے پیدا کیا اور مجھے آگ سے پیدا کیا، لہٰذا میں اس سے افضل ہوں تو میں اس کو سجدہ کیوں کروں؟ بہر حال، اس تکبر کے نتیجے میں وہ راندۂ درگاہ ہو گیا۔ العیاذ باللہ۔

بلعم باعور کا قصہ

دوسری نظیر ''بلعم باعور'' کی بیان فرمائی، ''بلعم باعور'' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص گزرا ہے، یہ بڑا عابد وزاہد شخص تھا، بلکہ ''مستجاب الدعوۃ'' تھا، یعنی جو دعا کرتا وہ فوراً قبول ہو جاتی تھی۔ چنانچہ لوگ اس کے پاس آکر اس سے دعائیں کرایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مقام عطا فرمایا تھا۔ یہ ''عمالقہ'' کے علاقے میں رہتا تھا، چونکہ اس علاقے کے لوگ کافر تھے، اسلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، جب علاقے کے کافروں کو پتہ چلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

حملہ کرنے والے ہیں تو وہ لوگ "بلعم باعور" کے پاس گئے، اور جا کر اس سے کہا کہ تم بڑے عابد و زاہد ہو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول فرماتے ہیں، آپ یہ دعا کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کو شکست ہو جائے اور ہم پر فتح نہ پاسکے۔

بلعم باعور نے کہا کہ میں یہ دعا تو نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں، اور جو لوگ لشکر میں ان کے ساتھ ہیں وہ سب صاحبِ ایمان ہیں، میں ان کے حق میں شکست کی دعا تو نہیں کر سکتا، انہوں نے اصرار کیا کہ آپ ضرور دعا کریں۔ تو اس نے کہا کہ اچھا! میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہوں، چنانچہ استخارہ کیا، اور استخارہ میں یہی جواب آیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، تم ان کے حق میں کیسے بددعا کرو گے؟ چنانچہ اس نے لوگوں کو جواب دے دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے بددعا کرنے سے منع فرمادیا۔

وہ لوگ دوسرے دن پھر اس کے پاس پہنچے، اور اس کے لئے رشوت کے طور پر کچھ ہدیے تحفے بھی لے گئے، اور اس سے کہا کہ یہ ہدیہ تحفہ لے لو اور دعا کردو۔ اب اس عابد کو چاہئے تو یہ تھا کہ جب استخارہ کے ذریعہ یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں ہے، تو بس ان سے انکار کر دیتا اور قصہ ختم ہو جاتا، لیکن جب ہدیہ تحفہ پہنچا تو ایک مرتبہ پھر استخارہ کرنے کی بات دماغ میں آگئی۔ چنانچہ ان سے کہا کہ اچھا میں ایک مرتبہ اور استخارہ کرلوں، جب دوبارہ استخارہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، تو اس نے لوگوں سے منع کر دیا کہ میں دعا نہیں کرتا۔ ان لوگوں نے پوچھا کہ

آپ نے جو استخارہ کیا تھا، اس کا کیا جواب آیا؟ اس نے کہا کہ جواب میں کچھ نہیں آیا، ان لوگوں نے کہا کہ بس پھر تو کام ہو گیا، اگر اللہ تعالیٰ کو آپ کو روکنے کی مرضی ہوتی تو اللہ تعالیٰ آپ کو منع کر دیتے، جب منع نہیں کیا اور جواب نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اجازت مل گئی۔ یہ تاویل قوم نے بھی کرلی اور اس کے ساتھ اس عابد نے بھی کرلی، اور بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کی ہلاکت کی بد دعا کر دی۔ العیاذ باللہ۔

چونکہ یہ بد دعا ایک نبی کے بارے میں تھی، اس لئے قبول تو نہیں ہوئی، البتہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بعد میں کئی سال تک میدان تیہ میں پھرتے رہے، یہ "بلعم باعور" کی دعا کا نتیجہ تھا۔ پھر اس عابد نے قوم سے کہا کہ میں نے تمہارے کہنے سے دعا تو کر دی تھی مگر اللہ تعالیٰ قبول نہیں کریں گے، کیونکہ میں نے پہلے ہی استخارہ کر لیا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ آپ نے جو گناہ کرنا تھا وہ تو کر لیا، اور اب دعا بھی قبول نہیں ہو رہی ہے، اب کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے لشکر کو بربادی کا سامنا کرنا ہی پڑے۔

اب اس عابد نے غور کرنے کے بعد کہا کہ اب میں ایسی تدبیر بتاتا ہوں جس کے نتیجے میں یہ لوگ خود اپنے آپ کو ہلاک کر دیں گے۔ وہ یہ کہ تم اپنی قوم کی نوجوان لڑکیوں کو تیار کرو اور ان کو بنا سنوار کر ان کے لشکر کے اندر داخل کر دو، اس لئے کہ یہ لوگ کافی عرصے سے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں، جب لڑکیاں ان کے پاس پہنچیں گی تو ان میں سے کوئی نہ کوئی گناہ میں مبتلا ہو جائے گا، جب یہ گناہ میں مبتلا ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف

سے ان پر عذاب آجائے گا، اس طرح تم ان کو ہلاک کر سکتے ہو۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا، اور نوجوان لڑکیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر میں داخل کر دیں، جسکے نتیجے میں بعض لوگ گناہ میں مبتلا ہو گئے۔ بلکہ واقعات میں لکھا ہے کہ عمالقہ کی شہزادی بنی اسرائیل کے ایک بڑے سردار کے پاس پہنچ گئی، وہ سردار اس شہزادی کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ شہزادی میرے اوپر حرام ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! یہ تم پر حرام ہے، اس نے کہا کہ حرام ہونے کے باوجود میں اس کو آج اپنے ساتھ لیجاؤں گا، چنانچہ وہ اس کو لے گیا اور پھر اس کے ساتھ بد عملی میں مبتلا ہوا، اس کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی نے جاکر ان دونوں کو نیزے سے قتل کر دیا۔ اس واقعے کے بعد اس بد عملی کے عذاب کے طور پر بنی اسرائیل کے اندر "طاعون" کی بیماری پھوٹی، چنانچہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ:

إنه بقية رجز أرسل إلى بنی اسرائیل

یعنی یہ طاعون اس عذاب کا بقیہ حصہ ہے جو بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا تھا۔

یہ سب کچھ "بلعم باعور" کی تجویز کی بنا پر ہوا، اس نے عمالقہ کو یہ حیلہ سکھایا تھا۔ اب دیکھئے کہ وہ بلعم باعور جو اتنا بڑا عابد، عالم، اور مستجاب الدعوۃ تھا، لیکن جب اس کا دل پھرا تو اس انجام کو پہنچا جس کا ذکر ان آیات قرآنی میں ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا

فَاتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ، وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ، فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ، اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ۔ (الاعراف:۱۷۵)

ترجمہ: ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے، جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں، پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا سو وہ گمراہ لوگوں میں داخل ہو گیا، اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے، لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا، اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا، سو اس کی حالت کتے کیسی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے، یا اس کو چھوڑے تب بھی ہانپے۔

دل کب پلٹے جاتے ہیں؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ "بلعم باعور" کی حکایت اس کی نظیر ہے۔ حالانکہ وہ اتنا بڑا عالم اور عابد اور مستجاب الدعوۃ تھا، اور لوگ اس کے پاس جاکر اپنے لئے دعائیں کراتے تھے، لیکن اس کا یہ انجام ہوا۔ دل پلٹتے دیر نہیں لگتی، لیکن اللہ تعالیٰ ظلمت کی طرف کسی کا دل ویسے ہی نہیں پلٹ دیتے کہ اچانک بیٹھے بیٹھے ایک مسلمان کافر بن جائے، بلکہ اس شخص کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں

جس کی بنیاد پر دل پلٹے جاتے ہیں۔ وہ حرکت یہ ہوتی ہے کہ اپنی عبادت پر گھمنڈ ہو گیا اور تکبر ہو گیا۔ اور تکبر کے نتیجے میں بڑوں بڑوں کے قدم توڑ دیے گئے۔

شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی ایک حکایت

حضرت شیخ عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایک حکایت لکھی ہے۔ یہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تہجد پڑھ رہے تھے، اس دوران انہوں نے دیکھا کہ ایک نور چمکا، اور پوری فضا منور ہو گئی، اور اس نور میں سے آواز آئی:

"اے عبد القادر! تو نے ہماری عبادت کا حق ادا کر دیا، جو عبادت اب تک تم نے ادا کر لی وہ کافی ہے، آج کے بعد تم پر نماز فرض نہیں، روزہ فرض نہیں، تمام عبادات کی تکلیف تم سے اٹھالی گئی"

یہ آواز نور میں سے آئی، گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ تیری عبادتیں اس درجہ میں قبول ہو گئیں کہ آئندہ کے لئے تجھے عبادتوں سے فارغ کر دیا گیا۔ حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ نور دیکھا اور یہ آواز سنی تو فوراً جواب میں فرمایا:

کمبخت! دور ہو، مجھے دھوکہ دیتا ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تو عبادتیں معاف نہیں ہوئیں اور ان پر سے

عبادتوں کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، مجھ سے ختم ہوجائے گی؟ تو مجھے دھوکہ دینا چاہتا ہے؟

دیکھئے: شیطان نے کتنا بڑا وار کیا، اگر ان کے دل میں عبادت کا ناز آجاتا تو وہیں پھسل جاتے۔ جو لوگ کشف و کرامات کے پیچھے بہت پڑے رہتے ہیں، ان کو ختم کرنے کیلئے تو شیطان کا یہ بہترین وار تھا، لیکن شیخ تو شیخ تھے، فوراً سمجھ گئے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر سے تو عبادت کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، میرے اوپر سے کیسے ختم ہوجائے گی؟

شیطان کا دوسرا حملہ

تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک اور نور چمکا اور فضا منور ہوئی اور اس نور میں سے آواز آئی:

"اے عبدالقادر! آج تیرے علم نے تجھے بچالیا، ورنہ میں نے نہ جانے کتنے عابدوں کو اس وار کے ذریعہ تباہ کردیا"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ فرمایا:

کمبخت! دوبارہ مجھے دھوکہ دیتا ہے، میرے علم نے مجھے نہیں بچایا، مجھے اللہ کے فضل نے بچایا ہے۔

یہ دوسرا حملہ پہلے حملے سے زیادہ خطرناک اور اس سے زیادہ سنگین تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ ان کے اندر علم کی بڑائی اور اس کا ناز پیدا کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے حملے کی سنگینی

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ پہلا حملہ اتنا سنگین نہیں تھا، کیونکہ جس شخص کے پاس ذرا بھی شریعت کا علم ہو، وہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ زندگی میں ہوش حواس کی حالت میں کسی انسان سے عبادات معاف نہیں ہو سکتیں، لیکن یہ دوسرا حملہ بڑا سنگین تھا، نہ جانے کتنے لوگ اس حملے میں بہک گئے، اس لئے کہ اس میں اپنے علم پر ناز پیدا کرنا مقصود تھا اور یہ باریک بات ہے۔

دل سے گھمنڈ نکال دو

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس تکبر کا علاج یہ ہے کہ آدمی یہ سوچتا رہے کہ کیسے کیسے بڑے صاحبانِ علم، صاحبانِ معرفت، عبادت گزار، متقی اور پارسا بھی جب گھمنڈ میں مبتلا ہوئے تو ان کا انجام کیا ہوا۔ العیاذ باللہ۔ لہٰذا دل سے گھمنڈ کو نکالو، اگر تم دین کے راستے میں لگے ہوئے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خلق خدا کی تحقیر میں لگ جاؤ اور ساری دنیا کی مخلوق کو جہنمی سمجھنے لگو۔ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من قال هلك الناس فهو اهلكهم

جو شخص یہ کہے کہ ساری دنیا تباہ ہو گئی تو سب سے زیادہ تباہ وہ کہنے والا شخص ہے۔ جس شخص کو اپنے عیوب نہیں نظر آرہے ہیں، اور ساری دنیا کے عیوب تلاش کرتا پھر رہا ہے، ان کی تحقیر کر رہا ہے، تو وہ شخص سب سے

زیادہ تباہ اور سب سے زیادہ برباد ہے۔

تکبر کا علاج، رجوع الی اللہ

لہٰذا جب کبھی دل میں اپنی عبادت کا، اپنے علم کا، اپنے زھد کا، اپنے صدقہ خیرات کا خیال آنے لگے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، اور کہو کہ یا اللہ! آپ کی دی ہوئی توفیق کے نتیجے میں میں نے یہ کام انجام دیا، میں اس پر آپ کا شکر ادا کرتا ہوں، یہ کام کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اور شیطان کے شر سے پناہ صرف رجوع الی اللہ میں ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عیوب کا استحضار کرو، جب دونوں چیزیں یعنی رجوع الی اللہ اور اپنے عیوب کا استحضار جمع ہو جائیں گی تو پھر تکبر پیدا نہیں ہونے دیں گی۔

"تواضع مفرط" کا پیدا ہونا

بہر حال، اس ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ دین کا کام کرنے والوں میں ایک تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات اس کے بالکل الٹ چیز یعنی "تواضع مفرط" (حد سے بڑھی ہوئی تواضع) پیدا ہو جاتی ہے۔ تواضع اچھی چیز ہے، لیکن یہ بھی اپنی حد کے اندر ہونی چاہئے، اگر حد سے آگے بڑھ جائے تو یہ بھی مضر ہے۔

"تواضع مفرط" کا ایک قصہ

اس بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وعظ میں اپنے سامنے کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا، کچھ اور لوگ بھی میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے جب کھانے کا وقت آیا تو

انہوں نے اپنا کھانا نکالا اور دستر خوان بچھایا، اور ساتھیوں کو جمع کر کے کھانا شروع کیا، تو جس طرح تواضعاً ہم کہتے ہیں کہ آیئے! دال روٹی آپ بھی کھا لیجئے، اسی طرح انہوں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے شخص سے تواضعاً کہا کہ کچھ گوہ موت آپ بھی کھا لیجئے" انہوں نے تواضعاً اپنے کھانے کو گوہ موت کہہ دیا۔ العیاذ باللہ۔ تو اللہ تعالیٰ کے رزق کو گوہ موت کہنا یہ "تواضع مفرط" ہے، اس لئے کہ تواضع کے نتیجے میں ایسا عمل کرنا جس سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری اور توہین اور تحقیر ہو جائے، یہ بری بات ہے، اور یہ تواضع کا حد سے بڑھ جانا ناشکری ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہے۔ اس لئے یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

اپنی نماز کو "ٹکریں مارنا" مت کہو

یہی تواضع مفرط انسان کو یاس تک پہنچا دیتی ہے اور انسان کے اندر مایوسی پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے آپ نے لوگوں سے یہ جملہ سنا ہو گا کہ: ارے ہماری نماز کیا ہے، ہم تو ٹکریں مارتے ہیں۔ اب نماز کو "ٹکریں مارنے" سے تعبیر کرنا "تواضع مفرط" ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے اپنی بارگاہ میں حاضری کی توفیق دی۔ نہ جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو بارگاہ میں حاضری کی بھی توفیق نہیں ملی، اس لئے کیوں اس نماز کی ناقدری اور ناشکری کرتے ہو؟ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری نماز میں بہت ساری کوتاہیاں بھی ہیں، لیکن وہ کوتاہیاں تمہاری ہیں، اور توفیق ان کی ہے، لہٰذا پہلے توفیق پر شکر ادا کرو، اور پھر کوتاہیوں پر استغفار کر لو۔

اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! آپ نے مجھے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، لیکن میں نے اس نماز کا حق ادا نہیں کیا۔ استغفر اللہ۔ لہٰذا پہلے اس عبادت کی توفیق پر شکر ادا کرو اور پھر اپنی کوتاہی پر استغفار کرو، یہ نہ کہو کہ ہماری نماز تو ٹکریں مارنا ہے، یہ بات کہنا کسی طرح بھی درست نہیں۔

کوتاہیوں پر استغفار کرو

اور جب تم اپنی کوتاہی پر استغفار کرو گے تو جس نے اس عبادت کے کرنے کی توفیق دی ہے وہ تمہارے استغفار کو قبول کر کے اس عبادت میں کمال بھی عطا فرمادے گا انشاء اللہ۔ ارے کوئی آدمی بھی ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کر سکے؟ ہم اور تم تو کس شمار میں ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کے پاؤں رات کو تہجد کی نماز میں کھڑے کھڑے سوج رہے ہیں، وہ یہ فرما رہے ہیں:

ما عبدناك حق عبادتك

ما عرفناك حق معرفتك

ہم آپ کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکے، جب وہ یہ فرما رہے ہیں تو ہم کیسے اس کی عبادت کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ ارے! ہماری تو ہر عبادت ان کی نسبت سے ناقص ہی رہے گی، لیکن جب انہوں نے اپنے در پر آنے کی توفیق دی، اپنے آستانے پر سجدہ کرنے کی توفیق دی، تو پھر اس سے یہ کیسی بدگمانی کرتے ہو کہ وہ یہ سجدہ قبول نہیں فرمائیں گے، اور کیسے تم اس سجدہ کی ناقدری کرتے ہوئے کہتے ہو کہ یہ گندہ سجدہ ہے۔ جب تم اس کی دی ہوئی توفیق پر شکر ادا کرنے کے بعد استغفار کرو گے اور یہ کہو گے کہ یا اللہ! اس

عبادت میں جو کوتاہی ہوئی ہے، اپنی رحمت سے اس کو معاف فرما دیجئے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کوتاہیوں کو ضرور معاف فرمائیں گے۔

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کا ایک واقعہ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب کوئی آکر یہ کہتا کہ میں نماز کیا پڑھتا ہوں، بس ٹکریں مارتا ہوں، تو آپ کو ان باتوں سے بہت توحش ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک صاحب نے آکر حضرت والا سے عرض کیا کہ حضرت! میری نماز کیا، میرا سجدہ کیا، جب میں سجدہ کرتا ہوں تو اس میں گندے گندے شہوانی اور نفسانی خیالات آتے ہیں، میری یہ نماز تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کے لائق بھی نہیں ہے۔ حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ اچھا یہ تمہارا سجدہ جو نفسانی اور شہوانی خیالات والا ہے، یہ تو بڑا گندہ سجدہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں! بالکل گندہ سجدہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا یہ گندہ سجدہ تم مجھے کرو، کیونکہ یہ شہوانی اور نفسانی خیالات والا سجدہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کرنے کے لائق تو نہیں ہے، لہٰذا یہ سجدہ اللہ میاں کے بجائے تم مجھے کرو۔ انہوں نے کہا کہ حضرت! یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ میں آپ کو سجدہ کروں؟ حضرت نے فرمایا کہ جب یہ گندہ سجدہ ہے، اور اللہ میاں کو کرنے کے لائق نہیں ہے تو مجھے کر کے دیکھ لو، انہوں نے کہا کہ حضرت! یہ نہیں ہو سکتا، میں یہ سجدہ کسی اور کو نہیں کر سکتا۔ حضرت نے فرمایا کہ جب یہ سجدہ کہیں اور نہیں ہو سکتا تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ سجدہ انہی کے لئے ہے، یہ پیشانی کہیں اور ٹک نہیں سکتی، یہ سجدہ کہیں اور ہو نہیں سکتا، یہ سر کسی اور آستانے پر جھک نہیں سکتا،

یہ سجدہ تو انہی کے لئے ہے اور ان کی توفیق سے ہے۔ البتہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے اس سجدے میں خرابیاں داخل ہو گئی ہیں، اس کی طرف سے استغفار کر لو، لیکن یہ پیشانی وہیں ٹکے گی۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ:

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو تیرے آستاں سے نسبت ہے

یہ سجدہ معمولی چیز نہیں۔ لہٰذا اس سجدے کے بارے میں جو الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو، ان کو چھوڑو اور اللہ جل شانہ کی توفیق پر شکر ادا کرو۔

عبادات چھڑانے کا طریقہ

ہوتا یہ ہے کہ شیطان "تواضع مفرط" پیدا کر کے اس کی راہ مارتا ہے اور اس کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ میں تکبر کی بیماری میں تو مبتلا نہیں ہوں، اس لئے کہ میں تو اپنی نماز کو کچھ سمجھتا ہی نہیں ہوں، اور ساتھ میں تواضع بھی اختیار کر رہا ہوں۔ لیکن یہ خیالات جب زیادہ ہو جاتے ہیں تو رفتہ رفتہ اس کے دل میں مایوسی پیدا کر دیتا ہے کہ یہ عبادت کرنا تیرے بس کی بات نہیں، تیری نماز کبھی قبول نہیں ہو سکتی، جب قبول ہی نہیں ہو گی تو پھر پڑھنے سے کیا فائدہ؟ لہٰذا چلو چھوڑو اور گھر بیٹھو۔ اس طرح یہ شیطان نماز چھڑا دیتا ہے۔

عبادات پر شکر ادا کرو

خوب یاد رکھو! جب بھی اللہ تعالیٰ کسی عمل کو کرنے کی توفیق دیدے، اس پر شکر ادا کرو، اور شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کہو کہ یا اللہ! آپ کی

توفیق سے میں نے یہ عبادت انجام دی، البتہ اس میں میری طرف سے جو کوتاہیاں شامل ہوگئی ہیں، اپنی رحمت سے ان کو معاف فرمادیجئے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرمایا کرتے تھے:

لولا اللہ ما اھتدینا

ولا تصدقنا ولا صلینا

اے اللہ! اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہمیں ہدایت نہ ملتی، اور اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہم نہ صدقہ دے سکتے تھے اور نہ نماز پڑھ سکتے تھے۔ جو کچھ ہے وہ آپ کی توفیق سے ہے۔ اس لئے ہم اس توفیق پر شکر ادا کرتے ہیں، اور اپنی کوتاہیوں سے استغفار کرتے ہیں۔ بس: اگر یہ دو باتیں پلے باندھ لوگے تو نہ کبر پیدا ہوگا اور نہ تواضع مفرط پیدا ہوگی، جو شیطان کے دو ہتھیار ہیں۔

شیطان کی کمر توڑنے والے الفاظ

میں نے اپنے شیخ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مقولہ سنا کہ "جو شخص کوئی بھی نیک عمل کرنے کے بعد یہ الفاظ کہہ دے:

"الحمد للہ، استغفر اللہ"

تو شیطان یہ الفاظ سن کر کہتا ہے کہ اس نے میری کمر توڑ دی۔ کیونکہ "الحمد للہ" کہنے سے توفیق پر شکر ادا ہو گیا تو اس سے کبر کی جڑ کٹ گئی، اور "استغفر اللہ" کہنے سے یہ ہوا کہ تواضع مفرط کے نتیجے میں جن کوتاہیوں پر نظر ہو رہی تھی، ان کی جڑ کٹ گئی، دونوں کا علاج ہو گیا۔ اس لئے ہر نماز کے بعد اور ہر نیک عمل کے بعد کہو "الحمد للہ، استغفر اللہ" اور یہ الفاظ کہتے وقت یہ کہو کہ یا اللہ! آپ نے مجھے نیک عمل کرنے کی توفیق

دی، اس پر میں "الحمد للہ" کہہ رہا ہوں، اور اس عمل میں میری طرف سے جو کوتاہیاں ہوئیں اس پر میں "استغفر اللہ" کہہ رہا ہوں کہ اے اللہ! مجھے معاف فرما دیجئے۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ہائے ہائے کرنے کی ضرورت نہیں، بس جو بھی عبادت کرو، اس کے بعد یہ پڑھ لو، انشاء اللہ شیطان کے عمل سے محفوظ رہو گے۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین